الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

دوسروں کی طرف مارچ کرنے کا نام فساد ہے
اور اپنی طرف مارچ کرنے کا نام جہاد

دسمبر ۱۹۸۸
شمارہ ۱۴۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۵ دسمبر ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

دو طریقے

ایک دیہاتی آدمی مدینہ آیا۔ وہ مسجد نبوی میں داخل ہوا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ موجود تھے۔ وہ مسجد کے اندر کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو تنبیہ کرنا چاہا مگر آپ نے منع فرما دیا۔ آپ نے کہا کہ دیہاتی کو چھوڑ دو اور ایک ڈول پانی لا کر وہاں بہادو۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ (بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابو داؤد، مؤطا)

دیہاتی پر اس واقعہ کا بہت اثر پڑا۔ اپنے قبیلہ میں واپس جا کر اس نے لوگوں سے پورا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ حرکت کی کہ عبادت خانہ میں پیشاب کر دیا۔ مگر خدا کی قسم، محمد نے مجھ پر غصہ نہیں کیا۔ انھوں نے مجھے نہیں جھڑکا (واللہ ما قھرنی محمد واللہ ما زجرنی محمد) قبیلہ کے لوگ یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے۔ حتی کہ سارا قبیلہ دین اسلام میں داخل ہو گیا۔

اب موجودہ زمانہ کا واقعہ لیجئے۔ ہولی کا دن تھا۔ ہندو نوجوانوں کی ایک پارٹی ہولی کھیلتی ہوئی شہر کی ایک سڑک سے گزر رہی تھی۔ راستہ میں ایک مسجد آگئی۔ ایک نوجوان نے جوش میں آکر مسجد کی طرف پچکاری ماری۔ مسجد کی ایک دیوار پر ہولی کے رنگ کے چھینٹے پڑ گئے۔ مسجد کی دیوار پر ہولی کا رنگ دیکھ کر وہاں کے مسلمانوں کو غصہ آگیا۔ وہ ہندو نوجوانوں سے لڑ گئے۔ مار پیٹ کی یہ خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر طرف فساد بھڑک اٹھا۔ مسلمانوں نے دیوار پر رنگ کو برداشت نہیں کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کی سڑکیں ان کے خون سے رنگین کر دی گئیں۔ اور ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

دو واقعہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائی دین پر تھے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان قومی دین پر ہیں۔ جو لوگ خدائی دین پر چلیں، ان کو فرشتوں کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ ان کے لیے دلوں کے بند دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو قومی دین پر چلیں۔ ایسے لوگوں کا ساتھی صرف ان کا نفس ہوتا ہے۔ ان کا عمل ضد اور نفسانیت کی آگ بھڑکاتا ہے۔ وہ دوسروں کو نفرت کا تحفہ دیتے ہیں، اس لیے دوسروں کی طرف سے بھی انھیں نفرت اور انتقام کا تحفہ دیا جاتا ہے۔

فتح بغیر جنگ

امریکی ہفتہ وار ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) کی کور اسٹوری جاپان سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے کہ کیا ایک اقتصادی دیو ایک عالمی طاقت بن سکتا ہے:

Super Japan: Can an economic giant become a global power?

۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے اوپر فتح کی خوشی منائی تھی۔ آج مفتوح جاپان خود امریکہ کے اوپر فتح حاصل کر رہا ہے۔ ابتداءً یہ فتح صرف اقتصادی معنی میں تھی، مگر اب وہ دوسرے دائروں میں وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ آج سب سے بڑا قرضدار ملک ہے جس کے اوپر ۴۰۰ بلین ڈالر کا خارجی قرضہ ہے۔ اس کے برعکس جاپان سب سے بڑا دائن ملک ہے جس نے دنیا کو ۲۴۰ بلین ڈالر قرض دے رکھا ہے۔

امریکہ میں آج کل کثرت سے ایسی کتابیں چھپ رہی ہیں اور ایسے مضامین شائع ہو رہے ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ امریکہ تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے اور اس کے مقابلہ میں جاپان تیزی سے ترقی کا سفر طے کر رہا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Prof. Paul Kennedy, *The Rise and Fall of the Great Powers*

ٹائم کے مذکورہ شمارہ کو پڑھنے کے بعد اس کے قارئین نے اس کو بہت سے خطوط لکھے۔ ان میں سے کچھ خط اس کی اگلی اشاعت (۲۵ جولائی ۱۹۸۸) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط پرنسٹن کے برائن مرسکی (Brian Mirsky) کا ہے۔ انھوں نے اپنے مختصر خط میں لکھا ہے کہ جاپان کی اقتصادی کامیابی پر آپ کا مضمون اس کو بالکل واضح کر رہا ہے کہ اگرچہ امریکہ نے جنگ جیتی تھی مگر جاپان نے امن کو جیت لیا:

Your article on Japan's economic success makes it obvious that although the U.S. won the war, Japan won the peace.

جاپان کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ خدا کی دنیا میں امکانات کا دائرہ کتنا زیادہ وسیع ہے۔ یہاں ایک مفتوح اپنے فاتح کے اوپر غالب آسکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے فاتح سے جنگ کی ہو، بغیر اس کے کہ اس کا اپنے فاتح سے کبھی ٹکراؤ پیش آیا ہو۔

دشمن سے سیکھنا

۱۹۴۹ میں جاپانیوں نے اپنے یہاں ایک صنعتی سیمینار کیا۔ اس سیمینار میں انھوں نے امریکہ کے ڈاکٹر ایڈورڈ ڈیمنگ (Dr Edward Deming) کو خصوصی دعوت نامہ بھیج کر بلایا۔ ڈاکٹر ڈیمنگ نے اپنے لکچر میں اعلیٰ صنعتی پیداوار کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ کوالیٹی کنٹرول (Quality control) کا نظریہ تھا۔ (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶)

جاپان کے لیے امریکہ کے لوگ دشمن قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کو بدترین شکست اور ذلت سے دوچار کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ جاپانیوں کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکے۔ مگر جاپانیوں نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی جذبات سے اوپر اٹھا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ امریکی پروفیسر کو اپنے سیمینار میں بلائیں۔ اور اس کے بتائے ہوئے نسخہ پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس کو دل وجان سے قبول کر لیں۔

جاپانیوں نے امریکی پروفیسر کی بات کو پوری طرح پکڑ لیا۔ انھوں نے اپنے پورے صنعتی نظام کو کوالیٹی کنٹرول کے رخ پر چلانا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے صنعت کاروں کے سامنے بے نقص (Zero-defect) کا نشانہ رکھا۔ یعنی ایسی پیداوار مارکیٹ میں لانا جس میں کسی بھی قسم کا کوئی نقص نہ پایا جائے۔ جاپانیوں کی سنجیدگی اور ان کا ڈیڈیکیشن (Dedication) اس بات کا ضامن بن گیا کہ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو۔

جلد ہی ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے کارخانے بے نقص سامان تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ یہ حال ہوا کہ برطانیہ کے ایک دکاندار نے کہا کہ جاپان سے اگر میں ایک ملین کی تعداد میں کوئی سامان منگاؤں تو مجھ کو یقین ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی نقص والی نہیں ہوگی۔ چنانچہ تمام دنیا میں جاپان کی پیداوار پر صد فی صد بھروسہ کیا جانے لگا۔

اب جاپان کی تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ وہ خود امریکہ کے بازار پر چھا گیا جس کے ایک ماہر کی تحقیق سے اس نے کوالیٹی کنٹرول کا مذکورہ نسخہ حاصل کیا تھا۔

اس دنیا میں بڑی کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو ہر ایک سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں، خواہ وہ ان کا دوست ہو یا ان کا دشمن۔

ناکامی میں کامیابی

سموئل بٹلر (Samuel Butler) انیسویں صدی کا مشہور انگریز مصنف ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ زندگی اس فن کا نام ہے کہ ناکافی مقدمات سے کافی نتائج اخذ کیے جائیں :

Life is the art of drawing sufficient conclusions from insufficient premises.

سموئل بٹلر نے یہ بات فطری تعقل کے تحت کہی ہے۔ مگر زندگی کے بارہ میں شریعت نے جو تصور دیا ہے وہ بھی عین یہی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے جو نظام بنایا ہے، اس میں آسانی کے ساتھ مشکل لگی ہوئی ہے (اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسراً) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک پہاڑی راستہ کو دیکھا جس کا نام لوگوں نے الضَّیِّقَة (دشوار) رکھ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اس کا نام تو الیُسریٰ (آسان) ہے۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی عُسر میں یُسر کو دریافت کرے۔ وہ دشوار گزار راستہ کو آسان راستہ کے روپ میں دیکھ سکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس تعلیم کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ کو سخت ترین مشکلات پیش آئیں، مگر آپ نے حکیمانہ تدبیر سے ان کو اپنے حق میں آسان بنالیا۔ آپ نے ڈس ایڈوانٹج کو ایڈوانٹج میں تبدیل کرلیا۔ ایک مستشرق مسٹر کیلٹ (E.E. Kellet) نے آپ کی اس صفت کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مشکلات کا سامنا اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں :

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

دنیا میں ایک طرف انسان ہے جو دوسرے انسان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف خدا کا نظام ہے جس نے ہر مشکل کے ساتھ اس کا حل بھی رکھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں انسانی مشکلات پر شور کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی نے انسان کے عمل کو دیکھا مگر وہ خدا کے عمل کو نہ دیکھ سکا۔ کیوں کہ اگر وہ خدا کے عمل کو دیکھتا تو شکایت کرنے کے بجائے وہ اس کو استعمال کرنے میں لگ جاتا۔

ضمیر کی آواز

کوریا ۱۹۰۵ سے جاپان کے تحت تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست کے بعد کوریا کی تقسیم عمل میں آئی۔ نارتھ کوریا روس کے زیر اثر آگیا اور ساؤتھ کوریا امریکہ کے زیر اثر۔

اسی وقت سے ملک کے دونوں حصوں میں رقابت جاری ہے اور دونوں برابر ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ۱۹۸۷ میں ساؤتھ کوریا میں اولمپک تھا۔ اولمپک کی میزبانی موجودہ زمانہ میں ایک باعزت چیز سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ نارتھ کوریا نے اس کو ناکام کرنے کا ایک خفیہ منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ ساؤتھ کوریا کے سفر کو پُرخطر بنا دیا جائے تاکہ اولمپک کے موقع پر باہر کے ملکوں سے ساؤتھ کوریا جانے والوں کی حوصلہ شکنی ہو:

to discourage foreign countries from participating in the Seoul Olympics.

اس مقصد کے لیے ایک ۲۲ سالہ کوریائی عورت کم ہیان ہی (Kim Hyon-Hee) اور ۶۹ سالہ مرد کم سنگ (Kim Sung II) کو تیار کیا گیا۔ منصوبہ کے مطابق دونوں بیٹی اور باپ کے روپ میں ۲۹ نومبر ۱۹۸۷ کو ساؤتھ کوریا کی ایرلائنز فلائٹ ۸۵۸ پر سوار ہوئے۔ یہ جہاز بغداد سے سیول جا رہا تھا۔ عورت کے پاس ایک پرس تھا جس کو اس نے "اوور ہیڈ لاکر" میں رکھ دیا۔ جہاز درمیان میں ابوظبی کے ہوائی اڈہ پر اترا تو وہ پرس کو جہاز کے خانہ میں چھوڑ کر اتر گئی۔

مذکورہ پرس میں بظاہر ایک ٹرانسسٹر تھا، مگر حقیقۃً وہ ٹائم بم تھا۔ جہاز جب ابوظبی سے اڑ کر دوبارہ فضا میں پہونچا تو بم پھٹ گیا۔ جہاز تباہ ہو گیا۔ اس وقت جہاز میں ۱۱۵ مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

ابوظبی میں اترنے والے مسافروں کا ریکارڈ دیکھ کر فوراً ان کی تلاش ہوئی۔ وائرلیس کے ذریعہ مختلف مقامات پر پیغام بھیج دیا گیا۔ آخر کار عورت اور مرد دونوں روم کے ہوائی اڈہ پر پکڑ لیے گئے۔ دونوں کے پاس سائنائڈ کیپسول (Cyanide capsule) تھا جس کو انھوں نے گرفتار ہوتے ہی فوراً نگل لیا۔ مرد اسی وقت مر گیا تاہم عورت بچ گئی۔

کچھ روز اسپتال میں رہنے کے بعد اس کو سیول لے جایا گیا۔ وہاں ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ کو ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے اخباری نمائندے بڑی تعداد میں جمع تھے۔ عورت کو اس پریس کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ اس کی تصویر انڈین اکسپریس (۱۷ جنوری ۱۹۸۸) میں چھپی ہے جس میں وہ سخت حواس باختہ حالت میں دکھائی دے رہی ہے۔

ٹائم (۲۵ جنوری ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، عورت نے روتے ہوئے اور سسکیاں بھرتے ہوئے اخباری نمائندوں کے سامنے کہا کہ جو گناہ میں نے کیا ہے وہ اتنا برا ہے کہ اس کے لیے مجھے سخت ترین سزا دی جائے اور مجھے ایک سو بار قتل کیا جائے:

I should be punished and killed a hundred times for my sin.

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک نہایت طاقت ور استعداد موجود ہے۔ یہ وہی ہے جس کو عام طور پر ضمیر کہا جاتا ہے۔ کسی لالچ میں یا کسی وقتی اشتعال کے تحت کوئی شخص ایک برا فعل انجام دے سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی وقتی جذبہ کا طوفان ہٹتا ہے۔ اس کا اندرونی ضمیر اس کو ملامت کرنے لگتا ہے۔ ضمیر کو چھوتے ہی اس کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنے جرم کو مزید جاری رکھ سکے۔

بعض سیاہ قلب یا پیشہ ور افراد کا اس میں استثنار ہو سکتا ہے۔ مگر عام انسانی فطرت یہی ہے۔ عام انسان اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا۔ کسی انسان کو اس کے جرم سے روکنے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کے اندر چھپے ہوئے ضمیر کو مخاطب بنایا جائے۔ ضمیر گویا خدا کی عدالت ہے۔ اور اگر مقدمہ ضمیر کے سامنے رکھ دیا جائے تو اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سچائی کے سوا کسی اور بات کا فیصلہ کرے۔



تجربہ کے بعد

ایک امریکی خاتون لنڈا برٹن (Linda Burton) نے اپنے خاندانی تجربات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے جس کا نام ہے —— تمہارے جیسی ایک تیز عورت گھر پر رہ کر کیا کام کرتی ہے :

What's a Smart Women Like You Doing at Home?

مذکورہ خاتون کی کہانی کا خلاصہ، ان کے لفظوں میں یہ ہے کہ میرا گھر پر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ایک کمپنی میں پورے وقت کی ملازم تھی۔ ۳۳ سال کی عمر میں میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کو سنبھالنے میں مجبورانہ طور پر مجھے اپنی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ میرے لیے معاشی مسائل پیدا ہوگیے، اور میں نے دوبارہ باہر کا کام کرنا شروع کر دیا۔

میں اپنے بچے کے لیے شام کا وقت اور ہفتہ کی چھٹی کا دن دے سکتی تھی۔ مگر وہ ناکافی تھا۔ اب میں نے اس کے لیے تحفظ اطفال کا ایک ادارہ تلاش کیا۔ مگر ایک مہینہ کے بعد ہی اس کو ناقص سمجھ کر مجھے چھوڑ دینا پڑا۔ میں ملازمت ترک کر کے دوبارہ گھر پر رہنے لگی تاکہ بچے کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں دو سال تک کسی زیادہ بہتر ادارہ کی تلاش میں رہی۔ یہاں تک کہ میرے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہوگیا۔

میں نے دوبارہ ایک ملازمت کر لی اور اپنے دونوں بچوں کو گھریلو قسم کے تحفظ اطفال کے ادارہ میں ڈال دیا۔ مگر اس کی کارکردگی پر مجھے اطمینان نہ ہو سکا۔ آخر کار میں نے خود اپنے گھر پر انفرادی خدمات حاصل کیں۔ میں نے پایا کہ آپ خواہ کتنا ہی قاعدہ قانون بنائیں۔ کتنا ہی زیادہ رقم خرچ کریں مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے لیے محبت کر سکے :

> In time, my search for child care taught me a critical lesson: no matter how many licences we issue, how many guidelines we establish or how much money we pay, it is impossible to have quality controls over the capacity of one human being to love and care for another (p. 94).

میں ایک ایسا شخص چاہتی تھی جو نرم مزاج اور محبت کرنے والا ہو۔ جو مستعد اور کسی قدر پُرمزاح ہو۔ ایک زندہ شخص جو میرے بچوں کی تخلیقیت کو بڑھائے، وہ ان کو تفریح کے لیے باہر بھی لے جائے۔ وہ ان کے تمام چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دے۔ وہ ان کو میٹھی نیند سلائے۔ آہستہ آہستہ اور تکلیف دہ

طور پر میں اس حیرت ناک واقفیت تک پہونچی کہ جس شخصیت کو میں برسوں سے تلاش کر رہی تھی وہ میری اپنی ناک کے نیچے موجود ہے، یعنی میں خود۔ یہ ہے وہ کام جو میرے جیسی تیز عورت اپنے گھر کے اندر کر رہی ہے :

> I had wanted someone who was loving and tender, with a sense of humour and an alert, lively manner — somebody who would encourage my children's creativity, take them on interesting outings, answer all their little questions, and rock them to sleep. Slowly, painfully, I came to a stunning realization: the person I was looking for was right under my nose. I had desperately been trying to hire me. And that's what a smart woman like me is doing at home.
>
> (*Reader's Digest*, August, 1988

مذہب کی تعلیم کے تحت معاشرت کا یہ اصول مقرر کیا گیا تھا کہ مرد کمائے اور عورت گھر کی دیکھ بھال کرے۔ اس طرح تقسیم کار کے اصول پر دونوں زندگی کا کاروبار چلائیں۔

یہ ایک انتظامی بندوبست تھا نہ کہ کسی کو بڑا درجہ اور کسی کو چھوٹا درجہ دینا۔ مگر جدید دور میں "آزادیٔ نسواں" کی تحریک اٹھی جس نے اس طریقہ کو عورت کی تصغیر کے ہم معنی قرار دیا۔ اور یہ نعرہ دیا کہ دونوں صنفوں کو کسی تقسیم یا حدبندی کے بغیر ہر کام کرنا چاہیے۔ یہ نظریہ اتنا پھیلا کہ عورتوں کی ایک پوری نسل گھر سے باہر نکل پڑی۔

نام نہاد مساوات کے اس تجربہ پر اب تقریباً سو سال بیت چکا ہے۔ خاص طور پر مغربی دنیا میں اس کا تجربہ آخری ممکن حد تک کیا گیا ہے۔ مگر ان تجربات نے اس کی افادیت ثابت کرنے کے بجائے صرف اس کا نقصان ثابت کیا ہے۔ موجودہ مغربی معاشرہ میں مختلف انداز سے مسلسل اس کی مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک مثال وہ ہے جس کو اوپر نقل کیا گیا۔

مذہب نے مرد اور عورت کے عمل کے درمیان یہ تقسیم رکھی تھی کہ مرد معاش فراہم کرے، اور عورت نئی نسل کی اخلاقی تعمیر کرے :

Man the bread-earner, woman the character-builder

جدید تہذیب نے اس مذہبی تعلیم سے انحراف کیا۔ مگر جدید تہذیب کے تجربات نے صرف یہ کیا ہے کہ اس نے مذہب کی تعلیمات کی صداقت کو از سر نو مزید قوت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔

دین کے بدلے دنیا

ڈیڑھ ہزار برس پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ حتی کہ توحید کے گھر کعبہ کو بھی بت خانہ بنادیا گیا تھا۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں "تحفظ کعبہ" کی مہم شروع کی۔ مگر مکہ کے لوگوں نے آپ کو حقیر بنادیا۔ یہاں تک کہ آپ کو ہلاک کرنے کے درپے ہوگیے۔ چنانچہ تقریباً ۱۳ سال کی پُرمشقت جدوجہد کے بعد آپ کو مکہ چھوڑکر ۳۰۰ میل دور مدینہ جانا پڑا۔ مگر آج یہ حال ہے کہ کعبہ تو درکنار کوئی شخص عام مساجد کے نام پر بھی اگر "تحفظ مسجد" کی تحریک شروع کرتا ہے تو اس کے چاروں طرف انسانوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ اس کے اوپر روپیہ کی بارش ہونے لگتی ہے۔ وہ صبح وشام میں عزّت ولیڈری کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔

مکی دور میں اہل مکہ مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک تعداد عرب سے نکل کر حبش چلی گئی۔ یہ سب کے سب اصحاب رسول تھے۔ مگر حبش میں نہ ان عربوں کا استقبال ہوا، نہ وہاں ان کے لیے عظیم الشان کانفرنسیں کی گئیں۔ وہ کچھ عرصہ تک وہاں محنت مزدوری کرتے رہے۔ اور اس کے بعد غیراہم آدمی کی حیثیت سے دوبارہ اپنے وطن واپس آگیے۔ مگر آج یہ حال ہے کہ اسی عرب کا کوئی شیخ جب ہندستان یا کسی اور ملک میں جاتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر واکابر ان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں اڈریس پیش کیے جاتے ہیں۔ اور عظیم الشان کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

لبید قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ مکی دور میں انھوں نے قرآن کو سنا۔ اس کو سن کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ انھوں نے جواب دیا: اَبعدَ القرآن۔ (کیا قرآن کے بعد بھی) لبید کے اس عمل پر قدیم عرب میں انھیں کوئی اعزاز نہیں ملا۔ لیکن آج اگر کوئی مشہور شاعر ایسا کرے کہ وہ شہر کے چوراہہ پر کھڑا ہو کر اپنے کلام کو جلادے اور کہے کہ میں نے قرآن کو پڑھا تو مجھے اپنی شاعری بھیکی معلوم ہونے لگی۔ اب میں شاعری کو چھوڑ کر قرآن کو اختیار کرتا ہوں تو ایسے شاعر کی ہر طرف دھوم مچ جائے گی۔ وہ صبح وشام میں عظمت اور مقبولیت کے آسمان پر پہونچ جائے گا۔

قدیم زمانہ اور موجودہ زمانہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اسلام اجنبی تھا۔ آج اسلام ایک معروف اور غالب دین بن چکا ہے۔ قدیم زمانہ میں صرف چند بے سروسامان لوگ اسلام کے ساتھ تھے۔ آج ساری دنیا میں ایک ارب انسان اسلام کے ساتھ ہیں۔ دولت اور اقتدار کے تمام اسباب اس کی پشت پر جمع ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دو دوروں میں مذکورہ بالا قسم کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

یہ معاملہ ہر دین کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اور اب مسلمانوں کے ساتھ یہی صورت پیش آرہی ہے۔

ابتدائی دور میں خدا کی کتاب اور خدا کے دین کے ساتھ دنیوی اہمیت کی چیزیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کتابِ خداوندی یا دینِ خداوندی کے نام پر دھوم مچا سکے۔ مگر لمبی مدت گزر جانے کے بعد خدا کی کتاب اور خدا کے دین کے اندر دنیوی اور قیادتی قدریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ خدا کے دین کو اسی طرح قیادتی عنوان یا تجارتی سودا بنایا جا سکے جس طرح کوئی شخص غیر دینی اور غیر خدائی چیزوں کو بناتا ہے۔

یہ ایک زبردست فتنہ ہے جو ہمیشہ بعد کے دور میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جس سے قرآن میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے کہ اللہ کی آیتوں کے بدلے ثمن قلیل نہ لو:

ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً (البقرہ ۴۱)

اور میری آیتوں پر تھوڑا مول نہ لو (یعنی دین کے نام پر دنیا نہ کماؤ)

قرآن میں اس مضمون کی کئی آیتیں ہیں جن میں اللہ کے کلام کے بدلے ثمن قلیل لینے کو منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں استغلال یا استحصال (Exploitation) کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کو اپنی قیادت کا عنوان بنانا۔ قرآن اور اسلام کا نام لینا اور اس کے ذریعہ سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرنا۔

موجودہ زمانہ میں یہ فتنہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ اسلام کے چیمپین بن کر عزت، دولت، قیادت کا ڈھیر اپنے گرد جمع کر رہے ہیں۔ مگر قیامت میں جب پردہ ہٹے گا تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے یہ چیمپین صرف اسلام کے سوداگر (Exploiter) تھے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسلام کا مقصد

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام عملاً ایک ناکام نظام ہے کیوں کہ وہ تیس برس سے زیادہ نہیں چل سکا۔ میں نے کہا کہ اس اعتراض کا تعلق اسلام سے نہیں ہے بلکہ ان نام نہاد اسلامی مفکرین سے ہے جنھوں نے اسلام کی غلط تعبیر کرکے اس کو ایک نظام کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کا مقصد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اسلام کو جانچنے کا ایک غلط معیار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ یہ بات بذات خود غلط ہے کہ اسلام کا مقصد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ اس لیے اس معیار پر اسلام کو جانچنا بھی درست نہیں ہو سکتا۔

بات کو واضح کرنے کے لیے میں نے ان کے سامنے ایک مثال دی۔ میں نے کہا کہ آپ تبلیغی جماعت کو لیجئے۔ تبلیغی جماعت کے متعلق اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا مقصد نئی دہلی کی پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کرنا ہے تو آپ کو نظر آئے گا کہ تبلیغی جماعت ایک سراسر ناکام جماعت ہے کیوں کہ وہ پارلیمنٹ ہاؤس پر ایک فی صد بھی سیاسی قبضہ حاصل نہ کر سکی۔ لیکن اگر آپ تبلیغی جماعت کو جانچنے کا یہ معیار قائم کریں کہ اس کا مقصد لوگوں کو ایمان اور نماز کے راستہ پر ڈالنا ہے تو معلوم ہوگا کہ تبلیغی جماعت ایک بے حد کامیاب جماعت ہے، کیوں کہ اس کی محنت نے لاکھوں لوگوں کو ایمان اور نماز کے راستہ پر ڈال دیا۔

میں نے کہا کہ آپ کا اعتراض نام نہاد اسلامی مفکرین کے خود ساختہ نظریہ پر وارد ہوتا ہے نہ کہ خدا اور رسول والے اسلام پر۔

یہ بات بذات خود بالکل غلط ہے کہ اسلام کا مقصد حکومت قائم کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کو ربانی انسان بنانا ہے۔ اسلامی جماعت کا صحیح نام جماعت ربانی ہے نہ کہ جماعت حکمرانی۔ اسلام کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسلام ایک ایک فرد کی اس فطرت کو جگانا چاہتا ہے جس پر اس کے خالق نے اسے پیدا کیا ہے، تاکہ انسان اپنے رب کو پہچانے، تاکہ وہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق قائم کرے، تاکہ وہ ایک آخرت پسند انسان بن جائے۔

دو قسمیں

ہر آدمی اپنی نفسیات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ کسی مسلمان کے اندر جس قسم کی نفسیات بنے گی، اسی کے مطابق اس کے تمام اعمال ظاہر ہوں گے۔ یہ نفسیات دو قسم کی ہو سکتی ہیں، ان کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

اسلام برحق ہے ، میں برحق ہوں

ان دو جملوں میں بظاہر صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ ایک فقرہ میں "اسلام" ہے، اور دوسرے فقرہ میں "میں"۔ مگر اسی معمولی فرق میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔ مسلمان جب ایک زندہ گروہ ہوں تو وہ اسلام کو برحق سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ تنزل کا شکار ہوں تو اپنے آپ کو برحق۔ پہلے تصور سے خوفِ خدا کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دوسرے تصور سے جھوٹے احساس برتری کا۔

اسلام بلاشبہ سب سے زیادہ سچا دین ہے۔ جب کسی آدمی پر اس کی سچائی منکشف ہوتی ہے تو اس کے اندر زبردست انقلاب آجاتا ہے۔ وہ اعلیٰ اخلاقیات کا پیکر بن جاتا ہے۔ وہ اسلام کو تمام انسانوں تک پہونچانے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ ارشمیدس کو صرف پانی کا ایک قانون دریافت ہوا تھا۔ اس سے وہ اتنا بے خود ہوا کہ حوض سے ننگا نکل پڑا، اور یوریکا، یوریکا (میں پاگیا، میں پاگیا) کہتا ہوا باہر بھاگا۔ پھر کائنات کی سب سے بڑی سچائی جس کو مل جائے اس کا حال کیا ہوگا۔

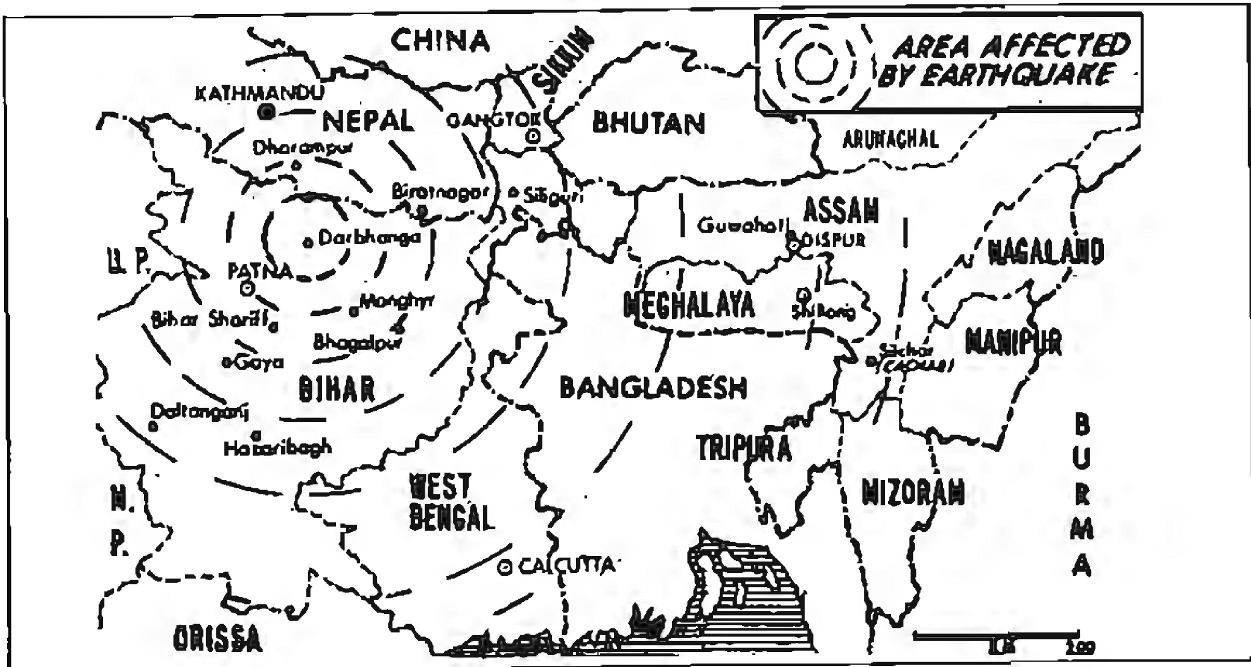
معرفت کے طور پر ملنے والا اسلام براہ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کے اندر وہ صفات ابھرتی ہیں جو خدا کو دیکھنے اور اس کا تجربہ کرنے والے کسی شخص کے اندر پیدا ہونی چاہئیں۔ وہ عظمتِ خداوندی سے کانپ جاتا ہے۔ خدا کے کمالات کا احساس اس سے سرکشی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص کو دین خاندانی اثاثہ کے طور پر ملے، اس کو وہ قومی فخر یا خاندانی اعزاز کے ہم معنی سمجھ لے گا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ہم نے جھوٹے فخر کا نام دیا ہے۔

سمندر کا پانی اڑ جائے تو اس میں صرف نمک ہی نمک رہ جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ ان کے دین سے جب خدا کا خوف نکل جائے تو اس کے بعد وہ صرف نمک بن کر رہ جاتا ہے جس کا ذائقہ لوگوں کو بدمزہ کر دے۔

بھونچال

زمین اچانک کانپنے لگی۔ مکانات ہلنے لگے۔ چارپائیاں جھولے کی طرح جھولنے لگیں۔ سوئے ہوئے لوگ اپنے بستروں پر جاگ اٹھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ زمین کی گڑگڑاہٹ اور انسانوں کی چیخ پکار نے ماحول کو آخری حد تک خوفناک بنا دیا۔ موت بالکل آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ اس وقت کسی کو دوسرے کا ہوش نہ تھا۔ ہر آدمی اپنا گھر چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے دولت مند افراد اور جھونپڑیوں میں زندگی گزارنے والے غریب مزدور، سب یکساں انداز میں ننگے پاؤں حیران و پریشان حالت میں کھلے میدان میں جمع ہو گئے۔ حواس باختہ اور دہشت زدہ چہرے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مگر کچھ بول نہ سکتے تھے۔

یہ ۲۱ اگست ۱۹۸۸ کا زلزلہ تھا جو صبح چار بج کر ۴۰ منٹ پر آیا اور تقریباً ایک منٹ تک باقی رہا۔ اس کا مرکز دربھنگہ (بہار) تھا اور اس کے شدید جھٹکے نیپال اور آسام تک محسوس کیے گئے۔ بڑے رقبہ میں مکانات تاش کے پتوں کی طرح گر پڑے۔ شہر اجڑ گئے۔ دریا ابل پڑے اور بلندیاں زمین میں دھنس گئیں۔ تقریباً ایک ہزار افراد ہلاک ہو گئے دس ہزار سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے۔ مکانات کی تباہی کی کوئی گنتی نہیں۔ زلزلہ کے دو ہفتہ بعد بھی دہشت کا یہ عالم تھا کہ نیپال کی راجدھانی کٹھمنڈو کے لوگ دوبارہ شہر میں جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہزاروں افراد شدید بارش کے باوجود خیموں میں راتیں بسر کر رہے تھے مگر زلزلہ سے



ٹوٹی ہوئی عمارتوں میں دوبارہ داخل ہونا انھیں منظور نہ تھا۔ لوگ اپنے گھروں کو خود ہی چھوڑ رہے تھے۔ اپنی جائدادوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کی محبوب جائدادیں نہ ہوں بلکہ ڈراؤنے بھوت ہوں جو انھیں کھا جانا چاہتی ہوں۔

زلزلے عذاب نہیں، زلزلے تنبیہ ہیں۔ وہ قیامت کے اس آنے والے عذاب کو یاد دلاتے ہیں جس کے مقابلہ میں انسان مکمل طور پر بے بس ہوگا اور جب خدا کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچانا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

ایک عام آدمی جب زلزلہ میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ زلزلے کیوں آتے ہیں۔ مگر سائنس داں اس کے برعکس یہ سوچتا ہے کہ زلزلے کیوں نہیں آتے۔ کیوں کہ ہماری زمین کی بناوٹ اس ڈھنگ کی ہے کہ اس کو ہر وقت ہلنا چاہیے یا کم از کم بار بار اس کو بھونچال سے دوچار ہونا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بہار اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں اس سے پہلے ۱۹۳۴ میں سخت زلزلہ آیا تھا جس میں ۱۰۷۰۰ آدمی ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ میں یہاں اس قسم کا زلزلہ آیا۔

ہمالیہ کا رقبہ، خاص طور پر اس کا شمال مشرقی علاقہ متحرک چٹانوں کے اوپر قائم ہے۔ اس قسم کے حلقہ کو بھونچالی حلقہ (Seismic belt) کہا جاتا ہے۔ زلزلے عام طور پر اسی طرح کے مقامات پر آتے ہیں۔ ہندستان میں اٹھارویں صدی کے آغاز سے زلزلوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق ۱۸۱۹ سے اب تک پندرہ بڑے زلزلے آچکے ہیں۔ سب سے زیادہ سخت بھونچال ۱۱ اکتوبر ۱۷۳۷ کو کلکتہ میں آیا تھا جس میں تین لاکھ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوگئے۔

ہماری زمین ہر وقت زلزلہ کی زد میں ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین پر ہر سال ایک ملین (۱۰ لاکھ) بار تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے ۹۵ فیصد وہ ہیں جن کو صرف سائنس داں اپنی ریکارڈنگ مشین کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں دنیا کے مختلف مقامات پر جو زلزلے آئے ہیں، ان میں تقریباً دو ملین (۲۰ لاکھ) آدمی ہلاک ہوگئے اور ۱۰ ہزار کرور روپیہ کی املاک کو نقصان پہنچا۔ زمین کی تھرتھراہٹ جب غیر معمولی شدت اختیار کرلے تو اسی کا نام زلزلہ یا بھونچال ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۲۳ اگست ۱۹۸۸)

زلزلے غیر محسوس حالت میں ہر روز آتے ہیں۔ خدا کبھی کبھی ان میں شدت پیدا کر کے ہمیں ان کی ہولناکی کو محسوس کرا دیتا ہے۔ یہ گویا ایک چیتاونی ہے کہ آدمی آنے والے بڑے زلزلہ (قیامت) کو یاد کرے اور اپنی اصلاح کر کے اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے بچالے۔

عجز کی قیمت

۳ مئی ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات میں صفحہ اول پر جن خبروں کو جگہ ملی، ان میں سے ایک خبر وہ تھی جو ہندستانی سینما کے مشہور شو مین (Showman) مسٹر راج کپور سے متعلق تھی۔ ۲ مئی کو ایک خصوصی تقریب میں بہت سی فلمی شخصیتوں کو انعامات دیے گئے۔ مسٹر راج کپور کو ایک خصوصی اوارڈ دیا جانے والا تھا جو ایک لاکھ روپیہ نقد اور ایک قیمتی شال پر مشتمل ہے۔ اسٹیج کے اوپر ہندستان کے پریسیڈنٹ اور دوسرے کئی وزیر موجود تھے۔ نیچے بھرے ہوئے ہال میں سامنے کی سیٹ پر مسٹر راج کپور بیٹھے ہوئے تھے۔ عین اس وقت ان کو دمہ کا شدید دورہ پڑا، وہ اٹھنے سے معذور ہو گیے۔ قاعدہ کے مطابق، راج کپور کو اوپر جاکر پریسیڈنٹ کے ہاتھ سے انعام لینا تھا۔ مگر پریسیڈنٹ وینکٹارمن نے جب راج کپور کا یہ حال دیکھا تو تمام صدارتی آداب کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ خود اسٹیج سے نیچے اتر پڑے تاکہ مسٹر راج کپور کو داداصاحب پھالکے اوارڈ دے سکیں جو آڈیٹوریم میں اپنی سیٹ پر تقریباً گر پڑے تھے:

The President, Mr. R. Venkataraman, setting aside all protocol, walked down the steps of Siri Fort stage to hand over the Dadasaheb Phalke Award to an ailing Raj Kapoor who nearly collapsed in his seat in the auditorium.

راج کپور اپنے عمل کے اعتبار سے صرف " پھالکے اوارڈ " کے مستحق تھے۔ مگر جب وہ عجز اور معذوری کی سطح پر پہونچ گیے تو وہ " پریسیڈنٹ اوارڈ " کے مستحق قرار پائے۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کمزور مومن کے مقابلہ میں طاقت ور مومن اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ مگر ہر ایک کے لیے خیر ہے۔ طاقت ور بندہ اگر حق کی حمایت کرکے اللہ کا پسندیدہ بنا تھا تو کمزور بندہ اپنے عجز کا اظہار کرکے اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ عاجز انسان زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بے پناہ قدرت کے مقابلہ میں اپنے بے پناہ عجز کو دریافت کرے۔ وہ عاجزانہ عبدیت کے نازک ترین اور لطیف ترین جذبات کو پیش کرکے خدا کی رحمت خاص میں حصہ دار بن جائے۔

توہینِ رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر عمرہ کریں۔ آپ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ بھی تھے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ، جو اس وقت مشرک تھے، انھوں نے طے کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں۔ آپ حدیبیہ میں ٹھہر گئے۔

اس کے بعد اہل مکہ سے بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران اہل مکہ طرح طرح کی اشتعال انگیزی کرتے رہے۔ مگر آپ قطعاً اس سے مشتعل نہیں ہوئے اور صبر و برداشت کے ساتھ ان سے بات چیت جاری رکھی۔ آخر کار دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ بھی تقریباً یک طرفہ تھا۔ اس میں بظاہر وہ تمام باتیں مان لی گئی تھیں جن کا مطالبہ اس وقت اہل مکہ کر رہے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت آپ کو پابند کیا گیا تھا کہ : آپ مکہ میں داخل نہ ہوں اور اس سال عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں۔ مکہ کا کوئی آدمی مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو اس کو دوبارہ مکہ واپس کر دیں۔ معاہدہ میں "محمد رسول اللہ" کا لفظ مٹائیں اور اس کے بجائے محمد بن عبد اللہ کا لفظ لکھیں وغیرہ۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سوچتے کہ اہل مکہ کی ان باتوں کو ہرگز نہیں ماننا ہے۔ کیوں کہ اس وقت اگر ان کی بات مان لی گئی تو آئندہ وہ اور زیادہ جری ہو جائیں گے۔ آج عمرہ کے لیے روک رہے ہیں، کل حج کے لیے روکیں گے۔ آج مکہ میں داخل ہونے پر پابندی لگا رہے ہیں، کل مدینہ میں داخلہ پہ پابندی لگائیں گے۔ آج نئے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل پرانے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہیں گے۔ آج رسول اللہ کا لفظ مٹانے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل خدا کا لفظ مٹانے کا مطالبہ شروع کر دیں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

مگر اہل مکہ کی ہٹ دھرمی کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں سوچا۔ آپ نے اس قسم کے تمام اندیشوں کو شیطانی وسوسہ قرار دیتے ہوئے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اہلِ مکہ کی تمام شرطوں کو مان کر مدینہ واپس چلے آئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کی یہ "واپسی" عظیم "اقدام" کے ہم معنی بن گئی۔ اس کے بعد اللہ کی مدد آئی اور صرف ۲ سال کے اندر مکہ بھی آپ کے قبضہ میں آگیا

اور مکہ والے بھی ۔

موجودہ زمانہ میں بھی مسلمانوں کے سامنے اس قسم کے معاملات پیش آرہے ہیں۔ غیر مسلم طبقہ کی طرف سے بعض اوقات ایسے مطالبے کیے جاتے ہیں جو مذکورہ بالا مطالبات کے مشابہ ہیں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اپنی سنت کی زبان میں مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ میں تمہارے لیے خدائی نمونہ ہوں۔ تم وہی کرو جو میں نے کیا۔ مگر مسلمان ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹے لیڈروں کے کہنے پر چل رہے ہیں نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر ۔

جب بھی مذکورہ نوعیت کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو نام نہاد لیڈر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو، ذرا بھی نرم نہ پڑنا۔ اگر تم نرم پڑے تو اغیار اور زیادہ کڑے ہو جائیں گے۔ دیکھو، ذرا بھی ان لوگوں کے ساتھ رعایت نہ کرنا۔ اگر تم نے رعایت کا معاملہ کیا تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے اور تمہارے ساتھ مزید سختی کا معاملہ کریں گے۔ ایسے مواقع پر مسلمان اپنے رسول کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیڈروں کے کہے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں ۔

یہ بلاشبہ سب سے بڑی توہین رسول ہے۔ جب ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے پکار رہے ہوں، اور دوسری طرف جھوٹے لیڈر اپنی جھوٹی آوازیں لگا رہے ہوں، ایسی حالت میں خدا کے رسول کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مسلمان خدا کے رسول کی پکار کو نظر انداز کر دیں اور لیڈروں کی پکار کی طرف دوڑ پڑیں ۔

یہ توہین رسول کا سب سے زیادہ بڑا واقعہ ہے جو آج خدا کی زمین پر پیش آرہا ہے۔ اور اس توہین رسول کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو توہین رسول سے روکنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں ۔

مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ موجودہ حالت میں ان کا یہ فعل غفلت پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اور جو لوگ غفلت پر سرکشی کا اضافہ کریں وہ اللہ کے نزدیک صرف اپنے جرم کو بڑھاتے ہیں، وہ کسی درجہ میں بھی اس کو کم نہیں کرتے ۔

علمی مغالطے

موجودہ زمانہ میں جن مغربی محققین نے مذہب کا علمی مطالعہ کیا، انھوں نے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا کہ مذہب پہلے شرک کی صورت میں پیدا ہوا، اس کے بعد توحید کا عقیدہ آیا۔ اس مفروضہ کا سبب تاریخ کے بارہ میں ارتقائی تصور تھا۔ اپنے ارتقائی ذہن کے تحت انھوں نے سوچا کہ مذہب نے ارتقار کے انداز میں سفر کیا ہوگا۔ پھر اس "ہوگا" کو "ہے" مان کر انھوں نے کہہ دیا کہ مذہب کا سفر ارتقائی انداز میں ہوا ہے۔ کائناتی مظاہر میں تعدد کو دیکھ کر ابتدائی انسان نے سمجھ لیا کہ خدائی میں بھی تعدد ہے۔ پھر جب علم بڑھا تو تعدد نے توحید کی صورت اختیار کر لی۔

مگر بعد کی زیادہ گہری تحقیقات نے اس نظریہ کی غلطی واضح کر دی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے توحید (Monotheism) کے زیر عنوان لکھا ہے کہ یہ فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ مذہب کی تاریخ میں کئی خداؤں کا تصور پہلے آیا اور ایک خدا کا تصور بعد کو پیدا ہوا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی مواد موجود نہیں ہے کہ ایک نظام عقائد دوسرے نظام عقائد کے مقابلہ میں زیادہ پرانا ہے، اگرچہ بہت سے اہل علم یہ مانتے ہیں کہ توحید مذہب کی اعلیٰ صورت ہے اور اس لیے بعد کو ظہور میں آئی، یہ فرض کرتے ہوئے کہ جو اعلیٰ ہے اسے بعد کو آنا چاہیے:

> There is no valid reason to assume that monotheism is a later development in the history of religions than polytheism. There exists no historical material to prove that one system of belief is older than the other, although many scholars hold that monotheism is a higher form of religion and, therefore, must be a later development, assuming that what is higher came later (12/381).

صحیح یہ ہے کہ توحید مذہب کی اصلی صورت ہے اور شرک مذہب کی بگڑی ہوئی صورت۔ لیکن مغربی علماء نے اپنے ارتقائی مفروضہ کے تحت یہ سمجھ لیا کہ شرک مذہب کی ابتدائی صورت ہے، اور توحید اس کی تکمیلی صورت۔ اس غلط مفروضہ کی بنا پر ان کا پورا نظریۂ مذہب غلط ہو گیا۔

توحید کو اصل اور شرک کو بگاڑ سمجھئے تو مذہب کی ایک شکل بنتی ہے، اور اگر توحید کو تکمیل اور شرک کو آغاز سمجھئے تو اس سے بالکل مختلف دوسری شکل۔

قربانی اسلام میں

حج ایک عالمی اور اجتماعی عبادت ہے۔ اس کی تاریخیں قمری مہینہ کے مطابق مقرر کی گئی ہیں۔ حج کے مراسم مکہ اور اس کے آس پاس کے مقامات پر پانچ دن کے اندر، ۸ ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ تک ادا کئے جاتے ہیں۔ اس دوران دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کی جاتی ہے۔ جانور کو ذبح کرتے ہوئے جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے:

اِنِّی وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السماواتِ والارضَ حنیفاً وما انا مِن المشرکین اِنَّ صَلاتی وَنُسُکی وَمَحیایَ وَمَماتِی لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ لاشَرِیکَ لَہ وبِذالکَ اُمِرْتُ وَاَنا مِنَ المُسلِمین اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ۔ بِسم اللّٰہِ اللّٰہُ اَکبر

میں نے یکسو ہوکر اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اے اللہ، یہ تیرا ہی دیا ہوا ہے اور تیرے ہی لئے ہے۔ اللہ کے نام سے، اللہ سب سے بڑا ہے۔

اس دعا میں وہ مقصد پوری طرح جھلک رہا ہے جس کے لئے قربانی کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنا محض ایک علامتی واقعہ ہے۔ اصل چیز جو حاجی سے یا صاحبِ قربانی سے مطلوب ہے وہ اس کی اپنی قربانی ہے۔ اصل مقصود ذاتی ذبیحہ ہے، جانور کا ذبیحہ تو صرف ایک ظاہری علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔

ذاتی ذبیحہ یا ذاتی قربانی سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد وہ انسان بننا ہے جس کو مذکورہ دعا میں حنیف اور مسلم کہا گیا ہے۔ یعنی سرکشی کا طریقہ چھوڑ کر پوری طرح تابع دار اور فرماں بردار بن جانا۔ اپنی خواہش کو رہنما بنانے کے بجائے خدا کے حکم کو اپنا رہنما بنانا۔ اپنی چیز کو اپنا کسب سمجھنے کے بجائے اس کو خدا کا عطیہ سمجھنا۔ یہی اسلام (حوالگی) قربانی کی اصل روح اور

اس کی اصل اسپرٹ ہے۔ کسی شخص کی قربانی اسی وقت قربانی ہے جب کہ قربانی سے اس کے اندر یہ روح پیدا ہو جائے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کو جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اللہ کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۲۷)

خوراک ہر آدمی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ آدمی اس دنیا میں کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی خوراک کو قربانی کے ذریعہ ایک بہت بڑے سبق میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ذی الحجہ میں خدا کے نام پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، وہ گویا وہی جانور ہے جس کو عام حالات میں بھی ذبح کر کے آدمی اپنی خوراک بناتا ہے۔ مگر حج کی مقدس عبادت کے ساتھ اس کو جوڑ کر اس بات کے سبق کا ذریعہ بنا دیا گیا کہ جس طرح تم جانور کو قربان کرتے ہو، اسی طرح تمہیں اپنے آپ کو قربان کرنا ہے۔ قربانی کے جانور کے گوشت کو صاحبِ قربانی خود کھاتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔ اور اگر وہ مقدار میں زیادہ ہو تو اجازت ہے کہ اس کو آئندہ استعمال کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔

قربانی کی ظاہری صورت تو جانور کو ذبح کرنا ہے مگر اس کی روح اور اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی تقاضوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا جائے۔ مقصد یا آدرش کی راہ میں اپنے آپ کو فنا کر دیا جائے۔ ہر چیز کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی اندرونی اسپرٹ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ قربانی کا ہے۔ اس کی ظاہری صورت ذبیحہ ہے، اور اس کی اصل اسپرٹ قربانی ہے۔

غور کیجئے تو ایک صحت مند سماج کو بنانے کے لئے واحد سب سے بڑی چیز جو درکار ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے افراد کے اندر قربانی کی اسپرٹ زندہ ہو۔ افراد کی قربانی پر ہی سماج اور قوم کو زندگی ملتی ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو قربانی کے ذریعہ صاحبِ قربانی کو دیا جاتا ہے۔

اس کی ایک مثال خود اس حکم کے اندر موجود ہے جو سفر حج کے دوران حاجی کو دیا گیا ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ جب حج کے لئے نکلو تو جدال نہ کرو (البقرہ ۱۹۷) یعنی سفر کے دوران تمہارا سابقہ جن لوگوں سے پیش آتا ہے ان سے جھگڑا اور تکرار نہ کرو۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خواہ مخواہ کسی سے جھگڑا اور تکرار نہیں کرتا۔ اس قسم کے ناخوشگوار واقعات ہمیشہ ردعمل کے طور پر پیش آتے ہیں۔ یعنی ایک ساتھی کی طرف سے کوئی قابلِ شکایت بات پیش آئی، اس پر دوسرا ساتھی بگڑ کر اس سے لڑنے لگا۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھئے تو مذکورہ حکم کا مطلب یہ ہے کہ قابل شکایت بات پیش آنے کے باوجود جھگڑا نہ کرو۔ یہ اعلیٰ اخلاق کی بات ہے، اور اس قسم کا اعلیٰ اخلاق قربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ آدمی جب اپنے اندر اٹھنے والے جوابی اشتعال کو دباتا ہے، وہ اپنے منفی جذبات کو قربان کر دیتا ہے تب جاکر یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کی قابل شکایت بات پر اس سے جدال نہ کرے۔ یہ قربانی ہی وہ زمین ہے جس پر وہ اخلاق قائم ہوتا ہے جو حاجی سے مطلوب ہے۔

فرد کے جذبات کی یہی قربانی صحت مند سماج بنانے کی واحد تدبیر ہے۔ جب بہت سے انسان مل کر رہتے ہیں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکراتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر لوگ جواب اور ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو پورا سماج خلفشار کا شکار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی نظام کو بہتر حالت پر باقی رکھنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں برداشت سے کام لیں جس کا دوسرا نام جذبات کی قربانی ہے۔ یعنی آدمی شکایت کو نظر انداز کرے۔ وہ ناگواری کو بھول کے خانہ میں ڈال دے۔ وہ اس طرح کے معاملات میں صبر وضبط کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ جواب اور ردعمل کا۔

قربانی کا سلوک ہی بہتر سماج کے قیام کا واحد ضامن ہے۔ جس سماج کے افراد میں برداشت اور قربانی کا مادہ نہ ہو، اس سماج میں کبھی امن اور انصاف کا ماحول قائم نہیں ہو سکتا۔ افراد کی قربانی سماج کو زندگی عطا کرتی ہے۔ جس سماج کے افراد قربانی والی روش پر راضی نہ ہوں، اس سماج کو اس دنیا میں زندگی اور ترقی کی نعمت بھی نہیں مل سکتی۔

قربانی کا طریقہ ہر مذہب میں رائج رہا ہے۔ یہ ایک مذہبی رسم ہے جس میں کسی چیز کو خدا کی نذر کیا جاتا ہے تاکہ اس کا تقرب اور وسیلہ حاصل کیا جائے۔ یہ طریقہ ہر مذہب میں اور ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے۔ یہ خدائے کبیر کے سامنے انسانِ صغیر کا نذرانہ ہے۔ آخری چیز جو کسی کے سامنے پیش کی جائے وہ جان ہے۔ انسان جب خدا کی عظمت سے سرشار ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اپنی جان اس کے اوپر فدا کر دے۔ اس موقع پر گویا اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی عنایت سے آدمی کی جان کے فدیہ کے طور پر جانور کی قربانی کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انسان کو موقع دیتا ہے کہ وہ زندہ رہ کر دنیا میں اعلیٰ مقصد کے لئے کام کرے۔ وہ اپنی سرفروشی کے جذبات کو تعمیری راہوں کی طرف موڑ دے۔

حج میں ضبط وتحمل کا تعلق محض انسانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ جانوروں تک کے بارہ میں حاجیوں کو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے :

عن ابنِ عباسٍ اَنّہ دفع معَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یومَ عرفۃَ فسمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وراءہ زجراً شدیداً وضرباً لِلاِبلِ۔ فاشار بسوطہ الیہم وقال : یاایہا الناسُ، علیکم بالسّکینۃِ فانَّ البرَّ لیسَ بالایضاع (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوچ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سخت ڈانٹ سنی اور اونٹ کو مارتے دیکھا۔ آپ نے اپنے کوڑے سے ان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، تم پر سکون لازم ہے۔ کیوں کہ نیکی تیز چلنے کا نام نہیں۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ کو نشر کی گئی۔

غلط بیانی

انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) میں اس کے ایڈیٹر مسٹر ارن شوری کے قلم سے ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کی سنسنی خیز سرخی یہ ہے ——— مگر خود آیات کے بارے میں کیا :

But what about the verses themselves?

اس مضمون میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ تاہم دوسری باتوں کو چھوڑتے ہوئے ہم اس کے صرف اس حصہ کے بارے میں کچھ عرض کریں گے جس کا تعلق براہ راست طور پر قرآن سے ہے۔ اس حصۂ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) پر حکومت نے جو پابندی لگائی ہے وہ اس لیے لگائی ہے کہ اس سے ایک فرقہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس منطق سے خود قرآن پر بھی پابندی لگائی جانی چاہیے کیوں کہ اس میں بھی ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے دوسرے فرقوں کے لوگوں کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں یا مجروح ہو سکتے ہیں۔

یہ آیتیں کیا ہیں۔ یہ آیتیں وہ ہیں جو جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ارن شوری نے اس قسم کی کچھ آیتوں کو نقل کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ کافروں کو مارو، انھیں قتل کرو۔ اس طرح کی آیتیں واضح طور پر غیر مسلموں کے جذبات کو مجروح کرنے والی ہیں۔ اس لیے ان کے خیال کے مطابق، خود قرآن پر بھی پابندی لگنا ضروری ہے۔

ارن شوری نے یہ بات آزادانہ تحقیق اور عقلی اظہار خیال (Rational discourse) کے نام پر کی ہے۔ مگر زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اپنی اس بات کو خود ساختہ الزام یا غلط بیانی (Rational falsification) کا نام دیتے۔ کیوں کہ انھوں نے قرآن کی جو چند آیتیں پیش کی ہیں وہ سب سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ایک ایسا خود ساختہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے جو خود آیتوں کے اندر موجود نہیں۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر ان کے پیش کردہ حوالوں میں سے دو بنیادی حوالوں کا ذکر کریں گے۔

سورہ البقرہ کی دو آیتوں کے جزئی حصہ کا ترجمہ (انگریزی میں) انھوں نے اس طرح نقل کیا ہے: اور ان کو نکالو جس طرح انھوں نے تم کو نکالا ہے، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے (۱۹۱) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے (۱۹۳)

اس طرح جنگ سے متعلق چند آیتیں نقل کرنے کے بعد انھوں نے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت کا ترجمہ (انگریزی میں) اس طرح دیا ہے: اور کسی مومن اور مومنہ کے لیے گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ پھر ان کو اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (۳۶)

اس طرح کے کچھ اقتباسات نقل کر کے مضمون میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن غیر مسلموں کو مارنے اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور جب خدا کا حکم آ جائے تو قرآن کے مطابق، مومنین قرآن پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بے چون و چرا اس کی تعمیل کریں۔ یعنی تلوار لے کر اٹھیں اور غیر مسلموں کو ایک طرف سے مارنا شروع کر دیں۔

ارن شوری کی اس لغو تشریح کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر ایک خود ساختہ تشریح ہے جو ناقص اقتباسات کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ یہ بات اس وقت نہایت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے جب کہ مذکورہ آیات کو ان کے سیاق (Context) میں رکھ کر دیکھا جائے۔

۱۔ سب سے پہلے سورۃ البقرہ کو لیجئے۔ اس کے جس حصہ سے مذکورہ الفاظ لیے گئے ہیں، اس پورے حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں، پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان سے جنگ کرو، یہی سزا ہے انکار کرنے والوں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (Persecution) باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر (۱۹۰-۱۹۳)

مذکورہ آیت میں " ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں " (وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم) کے الفاظ ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں دفاع (Defence) کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ جنگ کا۔ یعنی یہ کوئی مطلق یا عمومی ہدایت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اس ہنگامی صورت حال سے ہے جب کہ کچھ لوگوں نے جارحیت کا آغاز کر کے اہل ایمان کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہو۔ گویا کہ یہ دفاع کی آیت ہے نہ کہ قتال کی آیت۔ آیت کے اس ٹکڑے کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا :

And fight in the way of God those who fight you (2:190)

اب مسٹر ارن شوری یا ان کے ہم خیال لوگ بتائیں کہ دنیا کا کون سا قانون یا کون سا بین اقوامی رواج ہے جو دفاع کو قابل اعتراض قرار دیتا ہے۔ مسٹر ارن شوری کو اگر ہندستان کا پرائم منسٹر بنا دیا جائے تو کیا وہ ایسا کریں گے کہ وزارت دفاع کا شعبہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ کیا وہ بری، بحری، اور ہوائی افواج کے تمام لوگوں کو ریٹائر کر کے گھر بھیج دیں گے۔ ملک کے بچاؤ کے لیے جو ہتھیار جمع کیے گیے ہیں ان کو وہ بحر ہند میں پھنکوا دیں گے اور ملک میں فوجی سامان تیار کرنے کے جتنے کارخانے ہیں ان سب کو تبدیل کر کے انھیں کھیل اور تفریح کا کلب بنا دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور یقیناً نہیں کریں گے تو انھیں کیا حق ہے کہ قرآن کے ایک ایسے حکم پر اعتراض کریں جو دنیا کے تمام قوانین اور تمام بین اقوامی رواج کے مطابق عین درست ہے اور مسلّمہ طور پر ایک جائز حق ہے۔ یعنی جارحانہ کارروائی کے خلاف دفاع کا حق۔

۲۔ اب دوسری سورہ (الاحزاب) کے اقتباس کو لیجئے۔ اس آیت کا پورا ترجمہ یہ ہے : اور کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (۳۶)

سورۃ الاحزاب کی یہ آیت جس سلسلۂ بیان میں آئی ہے، اس کا قطعاً کوئی تعلق جنگ سے نہیں ہے۔ یہ آیت دراصل ایک معاشرتی اصلاح کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

مدینہ میں ایک خاتون تھیں جن کا نام زینب بنت جحش تھا۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۴ھ میں ان کے یہاں زید بن حارثہ کے لیے نکاح کا پیغام دیا جو ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ بظاہر ایک نابرابری کا رشتہ تھا۔ چنانچہ زینب بنت جحش اور ان کے گھر والوں نے اس کو نامنظور کر دیا، خود زینب نے کہا کہ میں زید سے نسب میں بہتر ہوں (انا خیر منہ حسباً)

زینب اور ان کے گھر والے سب کے سب مسلمان تھے۔ انھوں نے حسب نسب کے فرق کی بنیاد پر اس رشتہ کو ماننے سے انکار کیا تھا جو قرآنی اسکیم کے سراسر خلاف تھا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی شریعت خدا کے احکام پر مبنی ہے نہ کہ قومی اور خاندانی رواج پر۔ اگر تم واقعۃً اللہ اور رسول کے مومن ہو تو تمہیں وہی کرنا چاہیے جس کا حکم خدائی شریعت میں دیا گیا ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس آیت کے اترتے ہی زینب اور ان کے گھر والوں نے خاندانی نخوت کو ترک کر دیا اور خدا کے حکم کے مطابق زید بن حارثہ سے نکاح پر راضی ہو گئے (فامتنعت ثم اجابت)

اصل پس منظر کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ آیت ایک عظیم سماجی انقلاب کا عنوان ہے جب کہ تاریخ میں پہلی بار مصنوعی اونچ نیچ کو ختم کر کے حقیقی انسانی مساوات کو قائم کیا گیا۔ قرآن کی یہ آیت نہ صرف مومنین قرآن کے لیے بلکہ تمام قوموں کے لیے فخر کی آیت ہے۔ یہ آیت اس دن کو یاد دلاتی ہے جب کہ ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی انسانیت کو جھوٹے بندھنوں سے آزادی حاصل ہوئی اور تاریخ میں وہ نیا عمل شروع ہوا جو موجودہ زمانہ میں مساوات انسانی کے عمومی اعتراف کے مرحلہ تک پہنچا۔

آدمی کے اندر اگر اعتراف کا حوصلہ ہو اور اس کو دیکھنے والی آنکھ حاصل ہو تو وہ اس آیت میں سچی انسانیت کی روشنی دیکھے گا، مگر جو لوگ بصیرت سے محروم ہوں، ان کے لیے تو اجالا بھی ویسا ہی تاریک ہے جیسا کہ اندھیرا:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ایک مثال

انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۹۶ سے لے کر دفعہ ۱۰۶ تک ذاتی دفاع کے بارے میں ہیں۔ اس کی دفعہ ۹۶ آدمی کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنے دفاع (بچاؤ) میں لڑے۔ اگر کسی شخص پر جارحیت کی

جائے اور وہ اپنے دفاع میں دوسرے شخص پر حملہ کرے تو یہ قانونی اعتبار سے اس کے لیے جرم نہیں ہوگا :

Nothing is an offence which is done in the exercise of the right of private defence.

اب اگر کوئی شخص ان دفعات کو لے کر یہ کہنے لگے کہ ہندستان کا قانون ہر آدمی کو کھلی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف جس کو پائے اس کو مارنا شروع کر دے۔ تو ایسا شخص یقیناً غلطی کرے گا۔ کیوں کہ وہ خصوصی حکم کو عمومی حکم بنا رہا ہے۔ وہ دفاع کے حکم سے آزادی مذہب کا حکم نکال رہا ہے۔

ہندستان کا قانون مذہبی آزادی کے معاملہ میں کیا ہے، اس کو پینل کوڈ (قانون فوجداری) سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے دستور ہند کی وہ دفعہ دیکھنی ہوگی جو بنیادی حقوق (Fundamental rights) سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہندستان کے قانون نے مذہب کے معاملہ میں ہر آدمی کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ اس کے مطابق، نہ کسی سے اپنی پسند کا عقیدہ رکھنے کا حق چھینا جا سکتا اور نہ اس معاملہ میں اس کو مجبور کیا جا سکتا۔

مسٹر ارن شوری نے یہی غلطی قرآن کو سمجھنے میں کی ہے۔ وہ قانونِ دفاع اور قانونِ مذہب کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن سے "قتال" کی جو آیتیں نقل کی ہیں وہ سب دفاع کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی یہ کہ جارحیت کے وقت مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جہاں تک اس دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ مذہب کی آزادی کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے، اس سلسلہ میں مسٹر ارن شوری کو چاہیے کہ وہ قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کریں جو خاص طور پر اس دوسرے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً :

۱۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت (شیطان) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (البقرہ ۲۵۶)

۲۔ پس تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔ تم ان کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔

(الغاشیہ ۲۱-۲۲)

قرآن میں اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ عقیدہ یا مذہب کا معاملہ تمام تر ذاتی ضمیر کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ جس عقیدہ یا جس مذہب کو چاہے مانے اور جب چاہے اپنے ذاتی فیصلہ سے اس کو بدل دے۔ مذہب کے معاملہ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں۔ مذہب کے معاملہ میں صرف تبلیغ ہے نہ کہ جبر۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی قانون جارحیت کے موقع پر ہر شخص یا قوم کو اپنے دفاع (بچاؤ) کا حق دیتا ہے۔ مگر جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے، وہ ہر ایک کے لیے مذہبی آزادی کا حق تسلیم کرتا ہے۔ "قتال" کے قرآنی حکم کا تعلق صرف پہلے معاملہ سے ہے، دوسرے معاملہ سے جنگ وقتال کا کوئی تعلق نہیں۔

Pak award for Indian author

From Aroon Sharma

NEW DELHI, Nov

AN Indian author, Maulana Wahiduddin Khan, has bagg the prestigious "Seerat book award" of Pakistan carrying cash reward of 2,000 US dollar and a citation. The award is giver every year for a book in a foreigi language (other than Urdu) on the life and times of Prophet Muham mad.

The Maulana has won the award for his book "Muhammad the Prophet of Revolution" published by the Islamic Centre at Nizamudddin. Earlier, the author had won the award for the same book published in Urdu. The English version was first marketed in 1986 by the Maktaba Al-Risala—a well known book house.

The "Seerat book award" was presented by acting President Ghulam Ishaq Khan on October 25 at Islamabad. Born in 1925 at Azamgarh in Uttar Pradesh, Wahiduddin Khan published his first book in Urdu in 1955.

Till date he has to his credit 14 books in English, 16 books in Urdu

بین اقوامی مقابلہ سیرت
ہندستانی عالم کو پاکستانی

Pak award for Indian theologain

By a Staff Reporter

Maulana Wahiduddin Khan, the well-known Indian theolo... received ...

Seerat Book Award

Hindustan Times Correspondent

NEW DELHI, Nov 7 — Well-known Indian theologian Wahiduddin Khan has bagged the "Seerat Book Award" awarded annually by the Government of Pakistan for outstanding books on the life of Prophet Mohammad. He has won the award for his book, "Mohammad — The Prophet of Revolution" published by the Islamic Centre here.

The award carries a reward of $ 2,000 and a citation. The awards were presented by Pakistan President, Ghulam Ishaq Khan in Islamabad recently.

Earlier, in 1983, Maulana Wahiduddin Khan had won the same award for his book, "Paighambar-e-Inquilab".

This year award ...

(UNI) ...logian, ...has bag... "Seerat Book Award" for his ...mad — the Prophet of ...

پیغمبر انقلاب (انگریزی)

پاکستان میں سیرت کی کتابوں کا ایک بین اقوامی مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں اسلامی مرکز کی سیرت پر انگریزی کتاب پرافٹ آف ریولیوشن (مولفہ مولانا وحید الدین خاں) کو پہلے انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

ایک تبصرہ

مسٹر دلیپ ہیرو مسلم دنیا کے معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ۱۹۸۸ میں لندن سے چھپی ہے، اس کا نام اسلامی بنیاد پرستی ہے:

Dilip Hiro, *Islamic Fundamentalism*

اس کتاب میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے اسلامی بنیاد پرستوں کو شکست اور اس سے بھی زیادہ بری چیز ذلت، دونوں سے سخت طور پر دوچار ہونا پڑا۔ ان کا معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے پیغمبر محمد کی طرف لوٹ رہے ہیں اور اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو متعین کر کے اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی موجودہ سرگرمی شدید طور پر مغرب کے خلاف ردعمل اور ہر اس چیز سے نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جس کا تعلق مغرب سے ہو:

> Having experienced both defeat and, worse, contempt, the Islamic fundamentalists of today seek to do more than just follow their ancestor Muhammad and define the fundamentals of a religious system and adhere to them. Their drive today is explosively fuelled by a reactionary hatred of all that is Western.

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اٹھنے والی وہ تحریکیں جن کو مغربی پریس اسلامی فنڈمنٹلزم کہتا ہے، اور خود مسلمان جس کو صحوۃ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہنا پسند کرتے ہیں، ان کی اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ ردعمل اور نفرت کے طور پر اٹھی ہیں۔ وہ قومی تحریکیں ہیں نہ کہ اسلامی تحریکیں۔ اسلامی تحریک محبتِ اقوام کی زمین پر ابھرتی ہے۔ جب کہ یہ تحریکیں نفرتِ اقوام کی زمین پر ابھری ہیں۔ آپ ان تحریکوں کا کوئی پرچہ پڑھیں، یا ان کے کسی اجتماع میں شریک ہوں۔ آپ کو ان میں دوسروں کے لیے خیر خواہی اور شفقت کی خوشبو نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس آپ پائیں گے کہ وہ شکایت اور احتجاج جیسی باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی واقعہ مذکورہ بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ بظاہر یہ تبصرہ بہت تلخ ہے، لیکن اگر خالی الذہن ہو کر دیکھا جائے تو وہ عین درست نظر آئے گا۔

مصنوعی کامیابی

ستمبر ۱۹۸۸ میں ۲۲ واں اولمپک سیول (کوریا) میں ہوا۔ اس موقع پر ۲۴ ستمبر کو سو میٹر کی دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں کناڈا کے ۲۶ سالہ بن جانسن (Ben Johnson) نے سو میٹر کا فاصلہ تقریباً دس سکنڈ میں طے کرکے دوڑ کا جو کمال دکھایا وہ ناقابل یقین حد تک شاندار تھا۔ ٹی وی پر دوڑ کا منظر دیکھنے والے ایک شخص نے کہا کہ وہ اس طرح دوڑا جیسے کوئی سانڈ دوڑتا ہے:

He ran like a bull

بن جانسن مقابلہ جیت کر عالمی چمپئن بن گیا۔ اس نے صرف اپنے ۲۴ ستمبر کے حریفوں کو نہیں ہرایا تھا بلکہ دوڑ کے عالمی ریکارڈ کو توڑ کر دنیا کا سب سے زیادہ تیز رفتار انسان (Fastest man on earth) بن گیا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا کہ میں دنیا کا نمبر ایک شخص ہوں (I am the world no. 1) اس کی فاتحانہ تصویریں اگلے دن تمام دنیا کے اخباروں کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ گولڈ میڈل اور ایک ملین ڈالر سے زیادہ بڑی چیز وہ تھی جو اس کو عالمی شہرت کی صورت میں اچانک حاصل ہوگئی (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۸)

مگر بن جانسن کی خوشی دیر تک باقی نہ رہی۔ قاعدہ کے مطابق کھیل کے فوراً بعد اس کا پیشاب لیا گیا جو مخصوص ماہرین کے پاس سائنسی تجزیہ کے لئے بھیج دیا گیا۔ ۲۷ ستمبر کو اس جانچ کی رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ بن جانسن کی کامیابی کا راز مصنوعی دواؤں کا استعمال تھا۔ کھیل کے عالمی مقابلوں میں، کھیل کے وقت، شراب، منشیات یا ایسی دواؤں کا استعمال سختی کے ساتھ ممنوع ہے جو وقتی نشہ یا فوری طور پر مصنوعی قوت پیدا کرتی ہیں۔ بن جانسن نے مقابلہ کے میدان میں داخل ہونے سے کچھ پہلے اسی قسم کی ایک مقوی عضلات دوا (Muscle-building drug) پی لی تھی جس کو اسٹانازولول (Stanazolol) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس کی دوڑ دوا کے زور پر تھی نہ کہ اپنی نطری طاقت کے زور پر۔

مذکورہ دریافت کے بعد بن جانسن سے سونے کا میڈل چھین لیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ

اب اس کو کھیل کے عالمی مقابلوں میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ کناڈا کی حکومت نے اس کو ماہانہ ملنے والی امداد بند کر دی۔ اس طرح کی مختلف ذلتیں ایک کے بعد ایک اس کے سامنے اس طرح آئیں کہ اس نے سیول میں مزید ٹھہرنے کا حوصلہ کھو دیا۔ وہ فوری طور پر اپنے وطن (کناڈا) کے لئے روانہ ہو گیا۔ ۲۷ ستمبر کو ایرپورٹ کی جو تصویریں اخبارات میں آئی ہیں، ان میں دکھایا گیا ہے کہ فوٹو گرافر اس کی تصویر لینا چاہتے ہیں اور وہ مسلسل اپنا منھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے (ہندستان ٹائمز ۲۸ ستمبر ۱۹۸۸)

بن جانسن کے ایجنٹ لاری ہائڈبریخت (Larry Heidebrecht) سے پوچھا گیا کہ بن جانسن نے کیوں سیول چھوڑ دیا، حالاں کہ اس کو اپنے دفاع کے لئے یہاں موجود رہنا چاہئے تھا۔ انڈین اکسپریس (۲۸ ستمبر ۱۹۸۸) کے مطابق، ایجنٹ نے جواب دیا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ اس وقت سوالات کا جواب دینے کے قابل رہیں گے جب کہ آپ اپنی زندگی کے سب سے بڑے صدمہ سے دوچار ہوئے ہوں:

Do you think you would be around prepared to answer questions after the biggest shock of your life.

دنیا کے اس واقعہ میں آخرت میں پیش آنے والے اسی قسم کے واقعہ کی تصویر ہے۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگ آئیں گے جنھوں نے دنیا میں بظاہر بڑے بڑے اسلامی کارنامے انجام دئے ہوں گے۔ کوئی شخص عالم کی حیثیت سے مشہور رہا ہوگا۔ کسی نے اس اعتبار سے شہرت پائی ہوگی کہ اس نے دین کے کام میں بہت زیادہ مال خرچ کیا ہے۔ کوئی شخص مجاہد کا ٹائٹل پائے ہوئے ہوگا اور دین کی راہ میں جان دینے والے کی حیثیت سے قوم کے اندر ہیرو بنا ہوا ہوگا۔ مگر آخرت میں یہ لوگ جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ خدا کہے گا کہ تم نے جو کچھ کیا شہرت اور ناموری کے لئے کیا، نہ کہ میری رضا اور خوشنودی کے لئے۔ تمہاری مطلوبہ چیز تم کو دنیا میں مل چکی۔ یہاں اب تمہارے لئے کچھ نہیں۔

جو شخص دین کے میدان میں غیر خدائی زور پر دوڑے۔ جس کا جوش دنیا کے لیے ہو نہ کہ آخرت کے لیے، ایسے شخص کا انجام آخرت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی ہوگا جو بن جانسن کا انجام کمتر پیمانہ پر دنیا میں ہوا۔ مصنوعی زور پر دوڑنا نہ دنیا میں کسی کے لیے مفید ہے اور نہ آخرت میں۔

اسلام مغربی لٹریچر میں

ڈاکٹر ہٹی (Philip K. Hitti) عربی زبان اور تاریخ کے مشہور ماہر ہونے کی حیثیت سے مغربی دنیا میں مشرق قریب کے مسائل پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے عرب اور اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور مختلف انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار رہیں۔ ان کی کتابیں یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہی ہیں۔ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اور اس وقت پرنسٹن یونیورسٹی (نیوجرسی) میں سامی ادب کے پروفیسر ہیں۔

اسلام اور مغرب (Islam and the West) ڈاکٹر ہٹی کی کتاب ہے جو ۱۹۶۲ء میں امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ۱۹۰ صفحات ہیں اور اس کا موضوع عیسائی دنیا اور اسلام کے تمدنی تعلقات کی تاریخ ہے جس میں بازنطینی سلطنت کے وقت سے لے کر اب تک مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ پائے جاتے رہے ہیں۔ موصوف نے ترجموں کی مدد سے نہیں بلکہ اصل مآخذ سے براہ راست استفادہ کرکے یہ کتاب تیار کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب میں اسلام کا بالترتیب مذہب، ریاست اور کلچر کی حیثیت سے تعارف ہے۔ چوتھا باب ہے ـــــ "اسلام مغربی لٹریچر میں" پانچویں اور چھٹے باب میں بالترتیب مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر نفوذ و اثر دکھایا گیا ہے۔ ساتویں باب میں اس تحریک کا مختصر تعارف ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں جاری ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں قرآن اور دوسری قدیم کتابوں سے اسلام اور اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔ یہ اقتباسات کل ۲۹ ہیں۔

ذیل میں کتاب کے چوتھے باب (Islam in Western literature) کا ترجمہ دیا جارہا ہے، اس معذرت کے ساتھ کہ نقل کفر کفر نباشد۔

قرون وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں پیغمبر اسلام کو عام طور پر جعل ساز اور جھوٹے رسول کی حیثیت

سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ قرآن ان کی ایک بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریق حیات تھا، دنیا میں بھی اور دوسری زندگی میں بھی۔ اس زمانے میں مذہب، اسلام اور عیسائیت دونوں کے درمیان دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ دونوں طرف یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ان ہی کا مذہب تمام صداقتوں کا واحد خزانہ ہے۔ مگر سیاسی اور فوجی تصادم، نظریاتی تصادم سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

محمدؐ کے بعد ڈیڑھ صدی تک ان کے پیرو پہلے مدینہ، پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد سے نکل کر بازنطینی سلطنت کو روندتے رہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے ہوئے مسیحیت کے مشرقی دارالسلطنت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ کے سقوط (۱۴۵۳ء) کے بعد چار صدیوں میں مسلم سلجوق اور عثمانی ترک اپنی ہمسایہ مسیحی طاقتوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئے۔ ۷۱۱ء سے شروع ہو کر تقریباً آٹھ سو برس میں مسلمان اسپین کے ایک حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے فرانس تک پر دھاوا بول دیا تھا۔ سسلی دو صدیوں تک ان کے قبضہ میں رہا۔ اور اٹلی کے خلاف ایک فوجی اڈے کا کام کرتا رہا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کے دوران میں مغربی اقوام مسلمانوں کی زمین پر صلیبی جنگ لڑتی رہیں۔ ان صلیبی لڑائیوں کی یاد آئندہ نسلوں میں باقی رہی۔

زرتشت، بدھزم اور دوسرے کم ترقی یافتہ مذاہب کی کبھی اس طرح سے نفرت اور تحقیر نہیں کی گئی، جیسا کہ اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ قرون وسطیٰ کے مغرب کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ اور نہ انھوں نے مقابل میں آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس لئے یہ بنیادی طور پر خوف، دشمنی اور تعصب تھا جس نے اسلام کے بارہ میں مغرب کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا۔ اسلام کا عقیدہ ایک دشمن عقیدہ تھا۔ اس لئے وہ غلط نہ ہو جب بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جانا لازمی تھا۔

پھر زبان کا روک بھی تھا۔ مسیحیت اور دنیائے اسلام کے درمیان سیاسی اور فوجی تصادم کے چھ سو سال تک یورپ قرآن کی زبان کے باقاعدہ مطالعہ کی سہولت سے محروم رہا۔ اس پوری مدت میں لاطینی زبان کا کوئی عالم یورپ میں ایسا نہیں تھا جو عربی زبان پر بھی عبور رکھتا ہو۔ قرآن کی زبان سے اس کامل بے خبری نے قرآن کے بارے میں غلط تعارف کو پھیلنے کا موقع دے دیا۔

قرون وسطیٰ اور اس کے بعد کی مسیحیت نے جس تحریری یا زبانی ذرائع سے اسلام کے بارہ میں اپنا تصور قائم کیا، وہ وہی تھا جو صلیبی جنگوں کے دوران میں وجود میں آئے یا ان ممالک کی معرفت ملے

جن سے اسلام کی لڑائی پیش آ چکی تھی۔ مسیحی علماء اور پادریوں نے اسی کے ذریعہ سے اسلام کی تصویر بنائی۔ اسلام کی اس یورپی تصویر اور اس کی حقیقی اسلامی تصویر میں کوئی مشابہت محض اتفاقی ہے۔

شام کے مشہور عیسائی عالم سینٹ جان آف دمشق (۷۴۹ء) کو بازنطینی روایات کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ جان نوجوانی کی عمر میں بنو امیہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ عربی، سریانی اور یونانی زبانیں جانتا تھا اور اپنے زمانہ کے اہل علم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کیا ہے جس میں ایک جھوٹے رسول کی پرستش ہوتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق محمدؐ نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول وضع کئے۔ یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ ڈانٹے (م ۱۳۲۱ء) نے اپنی مشہور کتاب میں محمدؐ اور علیؓ کو نویں جہنم کے سپرد کر دیا جو تفرقہ پردازوں اور رسواکن اعمال کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے (نعوذ باللہ)

بازنطینیوں میں پہلا شخص جس نے محمدؐ کا باقاعدہ ذکر کیا اور اسلام پر گفتگو کی، وہ مورخ تھیوفین (Theophane) ہے جس کا زمانہ ۸۱۸ - ۷۵۸ ہے۔ وہ ایک خانقاہ کا بانی بھی تھا۔ تھیوفین بغیر کسی حوالے کے محمدؐ کو "مشرقی باشندوں کا حکمراں اور ایک بناوٹی رسول" لکھتا ہے۔ ڈانٹے کا ایک ہم عصر مسیحی جس نے بغداد کا سفر کیا تھا، اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شیطان جب خود مشرقی ممالک میں عیسائی مذہب کی ترقی کو روک نہ سکا تو اس نے اپنی طرف سے ایک آسمانی کتاب تیار کی اور ایک ابلیس فطرت آدمی کو اپنے وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ آسمانی کتاب قرآن اور وہ وسیلہ محمد ہیں۔ (نعوذ باللہ)

عبد المسیح بن اسحاق الکندی ایک مشرقی عیسائی تھا۔ اس کو اسپین میں ایک سید زادہ مسلمان نے تحریری طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ نے عرب کے اس عیسائی کو موقع دیا کہ وہ عیسائیت کا دفاع کرے اور اسلام پر حملہ آور ہو۔ الکندی نے محمدؐ کو ایک شہوت پرست اور ایک قاتل کی حیثیت سے پیش کیا جن کی کتاب محض مصنوعی الہامات کا مجموعہ تھی اور جن کا مذہب دھوکے، تشدد اور نفس پرستانہ تعلیمات کی چاٹ دلا کر پھیلایا گیا۔ (رسالات الکندی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۱۲ء)

ان باتوں کے نتیجہ میں عیسائی دنیا میں محمدؐ کے خلاف کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ کوئی

افسانہ خواہ وہ کتنا ہی عجیب ہو اور اس کی کوئی اصل نہ ہو، فوراً قبول کر لیا جاتا تھا۔ قرطبہ کا ایک بشپ ایولوگیس (Eulogius) جو اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، وہ ایک لاطینی تحریر کے حوالے سے جو ایک عیسائی راہب نے تیار کی تھی، لکھتا ہے کہ محمدؐ کی وفات کے بعد ان کے اصحاب فرشتوں کا انتظار کر رہے تھے جو اتریں اور ان کے جسم کو اوپر لے جائیں۔ مگر اس کے بجائے کتے آئے اور ان کے جسم کو کھا گئے اسی لئے مسلمان ہر سال بہت بڑے پیمانے پر کتوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ایولوگیس، اسپین کے مسلم دار السلطنت میں رہتا تھا۔ وہ معمولی کوشش سے جان سکتا تھا کہ اس پورے افسانہ میں صرف اتنی سی حقیقت ہے کہ مسلمان کتے کو ایک ناپاک جانور سمجھتے ہیں۔

لاطینی زبان سے یہ کتے کا افسانہ فرانسیسی میں پہنچا۔ چنانچہ ایک قدیم فرانسیسی نظم میں کتے اور سور دونوں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ محمدؐ کے جسم کو کھا رہے ہیں۔ سور کی یہ روایت عوام میں بہت مقبول ہوئی اور قرآن میں سور کی حرمت کی بہت آسان توجیہ بن گئی۔ (حالاں کہ سور کی حرمت آپ کی وفات سے بہت پہلے کا واقعہ ہے ــــ دروغ گو را حافظہ نباشد، مترجم) اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ محمدؐ کا تابوت زمین و آسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے۔ اور لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں صلیبی جنگوں کے ذریعہ اسلام کو مغلوب کرنے کی کوشش جب ناکام ہو گئی تو مسیحی حلقہ میں ایک نیا رجحان ابھرا ــــ اسلام کو تبلیغ و تحریص کے ذریعہ تباہ کیا جائے۔ بے دخلی کی کوشش کی جگہ عقیدہ کی تبلیغ نے لے لی۔ مشنری تحریک وجود میں آئی۔ کارملی رہبانوں کا حلقہ (Carmelite Friar Order) ایک صلیبی ہی نے (۱۱۵۴) ماونٹ کارمل پر قائم کیا تھا۔ اس صلیبی کا نام (Berthold) ہے۔ اس جماعت کے لوگ سفید چغہ پہنتے تھے، اسی لئے ان کو سفید پوش رہبان (White Friars) کہا جاتا ہے۔ (مترجم) فرانسس کن نے اس کی پیروی کی۔ ۱۲۱۹ء میں سینٹ فرانسس آف اسیسی قاہرہ گئے اور اپنی فرانسس کن مشنری سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مگر اس دور کی سب سے بڑی مشنری تحریک ایک اسپینی تحریک تھی، جو ریمنڈ لل (Raymond Lull) نے شروع کی جس کا زمانہ ۱۲۳۵ - ۱۳۱۵ ہے۔ لل نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کے لئے بہت دانشمندانہ نقشے بنائے جس کا مقصد مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ بحث و مناظرہ اور استدلال کے ذریعہ کامیاب ہونے کے بارے میں اس کا یقین آخر وقت تک قائم رہا۔ اس کی تیاری کے لئے اس نے عربی

پڑھی اور اپنی خانقاہ میں اس کا درس دینا شروع کیا جو اس نے مرامر (Miramar) میں قائم کی تھی۔ اس کی عربی زبان اور اسلام سے اس کی واقفیت اس زمانہ میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی۔ مگر ٹیونس میں اس کی مشنری سرگرمیاں ناکام ہوگئیں۔ توحید پرست مسلمانوں کے ذہن میں تثلیث کا عیسائی عقیدہ بٹھانے کی کوشش اتنی فضول تھی کہ بالآخر اس نے اسلام پر حملہ کرنا شروع کیا۔ وہ گلیوں میں نکل کر چلاتا پھرتا تھا ــ " عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ غلط ہے۔" ٹیونس میں ایک مشتعل مجمع نے اس پر حملہ کیا اور پتھر مارنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگیا۔

عیسائیت اور اسلام میں زبان کا روک پہلی بار اس وقت ٹوٹا جب فرانس میں قرآن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یہ بیرونی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ تخمیناً ۱۱۴۱ء میں کیا گیا اور اس کے کرنے والے تین عیسائی اور ایک عرب باشندہ تھا۔ اس ترجمۂ قرآن کے ساتھ ایک ضمیمہ اس عنوان کے ساتھ لگا ہوا تھا ـــــ "مسلمانوں کے عقائد کی تردید" اس کے بعد ۱۶۴۹ میں سیور ڈوریر (Sieur du Ryer) نے اس ترجمہ کی مدد سے قرآن کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ شخص اسکندریہ میں فرانسیسی قونصل رہ چکا تھا۔ پھر اسی سال سیور ڈوریر نے براہ راست عربی زبان سے فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد اس کو محمد کا قرآن (The Alcoran of Mahomet) کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا گیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا مقصد مترجم کے الفاظ میں " ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جو ترکی کے کھوکھلے مذہب (Turkish Vanities) کے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لفظ Mahomet خود محمدؐ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں اس کی اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ اسی طرح Mahound کی سترہ شکلیں Mohammad کی پانچ Muhammad کو لے کر ایک ہی نام کی اہم مختلف شکلیں، مصنف نے یہاں Maumet کو شمار نہیں کیا جس کی سب سے زیادہ شکلیں آکسفرڈ ڈکشنری میں بنائی گئی ہیں اور ان کو شامل کرنے کے بعد ناموں کی یہ فہرست ستر سے بھی زیادہ تک پہنچ جاتی ہے (مترجم)

قرآن کا یہ گمنام ترجمہ الکزنڈر راس (Alexander Ross) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اسپین میں نام نہاد مورس (Moors) کے زوال کے بعد عثمانی ترک دشمن مذہب (اسلام) کے علم بردار نظر آرہے تھے۔ مارٹن لوتھر نے پہلے یہ خیال کیا کہ ترکوں کو مسیحیت کے گناہوں کی پاداش میں

خدا کا بھیجا ہوا عذاب سمجھ کر گوارا کرنا چاہئے۔ مگر ۱۵۲۹ میں جب ترک وائنا کے دروازوں تک پہنچ گئے تو اس نے اپنے ذہن کو بدل دیا اور یہ تبلیغ کی کہ ان کافروں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ براہ راست عربی زبان سے ۱۷۳۴ میں کیا گیا، اور اس کا مترجم جارج سیل (George Sale) تھا۔ سیل عیسائی علوم کی ترقی کی انجمن کا ایک رکن تھا اور اس نے شامی علماء کی مدد سے عربی زبان سیکھی تھی۔ سیل کا ترجمہ انگریزی دنیا میں ڈیڑھ صدی تک چھایا رہا۔

سترہویں صدی میں ایک نیا سنگ میل پیدا ہوا جب آکسفرڈ یونیورسٹی نے عربی کی تعلیم کے لئے ایک نشست اپنے یہاں مخصوص کی۔ اور ایڈورڈ پکاک (Edward Pocock) کو ۱۶۳۶ میں اس منصب پر مقرر کیا۔ پکاک چھ سال تک شام میں پادری کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور عربی میں دستگاہ اور اسلام کی براہ راست معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آکسفرڈ میں عربی شعبہ کے کھلنے سے یورپی عربی داں پیدا ہونے کا دروازہ کھل گیا۔ پکاک خود غالباً اپنی صدی کا سب سے بڑا یورپی عربی داں تھا۔ اس نے متعدد کتابیں تصنیف یا ایڈٹ کیں۔ اس نے اپنے قارئین کو یقین دلایا کہ معلّق تابوت کا افسانہ مسلمانوں کے لئے ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کو وہ صرف عیسائیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ اس نے مزید اس مروجہ کہانی کو چیلنج کیا کہ اسلام کے بانی نے ایک سفید کبوتر کو تربیت دے رکھا تھا تاکہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لئے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے متبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعہ سے روح القدس ان کو الہام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر مشہور ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ شکسپیئر کے ایک کردار کی زبان سے ہم سنتے ہیں:

Was Mahomet inspired by a dove,
Thou with an eagle art inspired then.

شکسپیئر سے بہت پہلے جان لڈگیٹ (John Lydgate) م ۱۴۵۱ اس کبوتر کا رنگ تک جانتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کبوتر کا رنگ دودھیا سفید تھا۔ پھر یہ یقین یہاں تک بڑھا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک کبوتروں کے ماہر نے ایک خاص قسم کے کبوتر کا نام موٹ (Maumet) رکھ دیا جو دراصل لفظ محمدؐ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کبوتر عیسائیوں کے یہاں تو روح القدس کی علامت ضرور ہے (لوقا ۳ : ۲۲) مگر اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

اسی طرح مومٹ (Maumet) کا لفظ بت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ وہ شخص جس نے کعبہ میں سیکڑوں بتوں کو توڑا ، جس کے پیرو فخر کرتے ہیں کہ وہی صرف حقیقۃً توحید پرست ہیں اور کسی قسم کے بت یا مورتی کو تسلیم نہیں کرتے ۔ وہی شخص مغربی من گھڑت میں ایک خدا اور ایک بت بن گیا۔ قرون وسطیٰ کی انگریزی روایات میں مہون (Mahoun) بار بار پرستش کا ایک مظہر قرار دیا گیا ہے۔ یہ مان لیا گیا تھا کہ ترکوں اور مسلمانوں کے یہاں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

مومٹ کی طرح قرآن بھی الکرون (Alkaron) کے نام سے مسلمانوں کا ایک بت قرار پایا۔ مغربیوں کو یقین دلایا گیا کہ مسلمان اپنے بتوں کے آگے عبادتی رسوم منعقد کرتے ہیں جن میں لوبان جلایا جاتا ہے اور نرسنگھا پھونکا جاتا ہے۔ اسی طرح سورج (Apollo) ان کا دوسرا دیوتا تھا۔ ایک فرانسیسی مصنف کے بیان کے مطابق ۷۷۸ء میں شارلی مین کی فوجوں سے مسلمانوں کو "شکست" ہوئی تو انھوں اپنا غصہ سورج دیوتا کے اوپر نکالا اور اس پر پل پڑے۔ ایلزبتھ کے دور کا ایک اور نامور مصنف فرانسس بیکن (Francis Bacon) محمدؐ کو عطائی (Mountebank) قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے مقالہ "ہمت واستقلال" (Boldness) میں نقل کیا ہے :

"محمدؐ نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑی کو بلائیں گے اور وہ ان کے پاس چلی آئے گی۔ لوگ جمع ہوئے۔ محمدؐ نے پہاڑی کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے اور جب پہاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی تو وہ ذرا بھی نہیں شرمائے۔ بلکہ انھوں نے کہا ــــ" اگر پہاڑی محمدؐ کے پاس نہیں آسکتی تو محمدؐ تو پہاڑی تک جا سکتے ہیں"

Works of Francis Bacon, Vol. II. London 1929, p. 279

مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اس واقعہ کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ تاہم قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے اسی خلاف اسلام انداز کو نہیں اپنایا تھا۔ صلیبی دور کا ایک بشپ جس کی پیدائش شام میں ہوئی تھی ، ولیم آف ٹریپولی (William of Tripoli) نے ۱۲۷۰ میں ایک رسالہ لکھا جس میں اگرچہ محمدؐ کو وہ جھوٹے رسول کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ مگر آپ کے حالات میں دشنام طرازی اور افسانوی حصے کو بہت کم کر کے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ۱۶۷۹ میں ایک انگلش پادری لانسلاٹ اڈیسن (Lancelot Addison) نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ان من گھڑت اجزاء کو الگ کرنے کی

کوشش کی جو محمد کے نام کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ بعض بعض مواقع پر اس نے پہلے کسی واقعہ کی افسانوی تصویر کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اڈیسن کے ایک ہم عصر ہمفری پرائیڈکس (Humphrey Prideaux) نے آپ کی مکمل سوانح حیات لکھی جس میں کبوتر کے قصہ کو اور اسی طرح دوسری بہت سی کہانیوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ان کو صحیح ماننے کے لئے کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم اس سوانح حیات کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام ایک مکارانہ مذہب (Fraudulent Religion) کا معیاری نمونہ ہے۔ یہ سوانح عمری ایک صدی تک مغربی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

زیادہ رواداری کا نقطۂ نظر اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مغرب کے عربی دانوں نے اسلام کے متعلق زیادہ قابل اعتماد ذرائع کا ترجمہ کیا۔ سیاح اور تاجر زیادہ اچھے تاثرات لے کر لوٹے اور سفیروں اور مشنری کے عہدیداروں نے بھی اضافۂ معلومات میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر جارج سینڈیز (George Sandys) جس نے قسطنطنیہ، مصر اور فلسطین کی زیارت کی تھی، وہ ۱۶۱۵ء میں اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے مسلمانوں کی اور بہت سی چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ کی تعریف کرتا ہے جو عیسائی اور یہودی غربا کو بھی دی جاتی تھی۔ تاہم زیادہ تر مشاہیر میں لوگ ذاتی تحقیق سے زیادہ روایتی معلومات ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ حتیٰ کہ متخصصین پروفیسروں تک کا یہ حال تھا کہ پیدائشی طور پر سنی سنائی روایات کو دہرا دیا کرتے تھے۔ پکاک کا جانشیں جوزف وائٹ (Josef White) ۱۷۸۴ میں اپنے مشہور بیمپٹن لکچرز (Bampton lectures) میں مسیحیت کی حمایت کرتے ہوئے جب اسلام پر آیا تو محمد کے لئے اس کے پاس جو لفظ تھا وہ وہی عام روایتی لفظ تھا یعنی مکار اور فریبی (Imposter) اسی طرح بعد کے ممتاز علماء مثلاً ولیم میور (اڈنبرا یونیورسٹی)، ڈی ایس۔ مارگولیتھ (آکسفرڈ) ہنری لامنز (بیروت یونیورسٹی) کے یہاں بھی قدیم رجحانات کے آثار ملتے ہیں۔

مقالہ نگاروں اور مورخوں کے ہاتھوں میں محمدؐ، قرآن اور اسلام کا معاملہ اس سے بہتر رہا ہے جو پہلے مذہبی علماء، ناول نگاروں اور شاعروں کے ہاتھ میں ان کا حشر ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر نام سائمن آکلے (Simon Ockley) کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تاریخ پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ کیمبرج کا یہ عالم بھی مکار (Imposter) کو محمد کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور اسلام اور توہمات اس کے یہاں مرادف الفاظ ہیں۔ مگر

مخصوص تاریخی واقعات کے بیان میں اس نے راست گوئی سے کام لیا ہے۔ شام کی فتح کا حال بتاتے ہوئے، مثال کے طور پر، وہ بازنطینیوں کی غارت گری اور دغا بازی کا مقابلہ ابوبکر کی نوجوں کی شجاعت اور ان کے اعلیٰ رویہ سے کرتا ہے جن کو خلیفہ کی ہدایت تھی کہ کسی عورت یا بچہ کو قتل نہ کریں، کھجوروں کے درخت نہ کاٹیں اور نہ کھیت کو نقصان پہنچائیں۔ آکلے کی اس کتاب نے مستند درجہ حاصل کیا اور گبن کے ظہور سے پہلے تک وہ عرب تاریخ پر بنیادی ماخذ سمجھی جاتی رہی۔

اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) جو جدید انگریزی تاریخ کا بانی ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب "سلطنت روما کا زوال" کی پانچویں جلد کے پچاسویں باب کو اس موضوع کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اپنے اعتراف کے مطابق وہ "مشرقی زبانوں سے مکمل طور پر ناواقف" تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا ماخذ وہی کتابیں تھیں جو اس سے پہلے یورپ میں لکھی گئی تھیں اور اس بنا پر اس کی ترجمانی بھی واقعہ کے مطابق نہ ہو سکی۔ تاہم اس نے بہت سی روایات کو غلط قرار دیا مثلاً اس نے کہا کہ مکار نبی کا لقب ایک خطرناک اور ناقابل اعتبار (Perilous and Slippery) چیز ہے۔

فرانس میں والٹیر پیدا ہوا جو بحیثیت مورخ زیادہ محتاط تھا مگر بحیثیت المیہ نگار (Tragedian) محتاط نہیں تھا۔ اپنی تاریخی کتاب ۱۷۵۶ میں وہ محمدؐ کا ذکر رواداری کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ محمد کا مقابلہ کرامویل (Cromwell) سے کرتا ہے۔ وہ ان کے کارناموں کو انگلینڈ کے نجات دہندہ (کرامویل) سے بہت زیادہ عظیم قرار دیتا ہے مگر اپنے المیہ ناٹک (Tragedy) ۱۷۴۲ میں وہ محمد کو قرون وسطیٰ کے لباس میں مکار، ظالم اور عیاش بنا کر پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ والٹیر کا اسلام پر حملہ، عمومی طور پر اس کے مخالف مذہب ہونے کا نتیجہ تھا۔ والٹیر کا انحصار انگریزی مآخذ پر تھا۔ خاص طور پر سیل کا ترجمہ قرآن کیوں کہ وہ انگلینڈ میں رہا تھا اور انگریزی زبان سیکھی تھی۔

والٹیر سے زیادہ جرمن شاعر گوئٹے (۱۸۳۲-۱۷۴۹) وہ شخص تھا جو جدید اسپرٹ اور نئے بین اقوامی نقطۂ نظر کا پیامبر بنا۔ گوئٹے نے اپنی زندگی میں محمدؐ کے حالات پر ایک نظم شروع کی مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکا۔ گوئٹے یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ عربی پیغمبر ایک مکار شخص تھا۔ سعدی کی گلستاں کے جرمن ترجمے نے خاص طور پر گوئٹے کو بہت متاثر کیا۔ ۱۸۱۲ میں حافظ کے کلام کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا تو گوئٹے کو اس میں حکمت، تقدس اور سلامتی نظر آئی جو اس کے خیال میں مغرب

کو خاص طور پر درکار تھی۔

اسلامی کلچر کے بارے میں مغربی علماء کا بدلا ہوا نقطہ نظر جس کا آغاز انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں نے کیا تھا اور جرمن اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے جس کو تقویت دی تھی، وہ انیسویں صدی کے وسط تک بالکل واضح ہوگیا۔ کارلائل کا محمدؐ کو پیغمبرانہ ہیرو کے کردار کے لئے منتخب کرنا، بیک وقت نئے رجحان کی طرف اشارہ تھا۔ اور اس میں اضافہ کرنے والا بھی تھا۔ کارلائل کی کتاب میں مشکل سے کوئی ناخوشگوار فقرہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کتاب اس لئے قابل تنقید ہوسکتی ہے کہ وہ غیر تنقیدی ہے "محمدؐ ایک سازشی مکار ہیں، وہ جھوٹ کا مجسمہ ہیں۔ ان کا مذہب محض عطائی نسخوں کا مجموعہ ہے —— اس قسم کی باتیں کارلائل کو گوارا نہیں تھیں۔ اس کا ہیرو (محمد) واقعی ایک انسان تھا، سچا انسان۔

عرض مترجم

اوپر جو ترجمہ نقل کیا گیا ہے، وہ بتاتا ہے کہ عیسائی حضرات نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے کتنی زیادہ لغو حرکتیں کی ہیں۔ مزید یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ساتھ کس قدر ظالمانہ سلوک کیا گیا ہے۔

خدا کے پیغمبر خالص سچائی کے علمبردار تھے۔ ان کا وجود ان لوگوں کو غیر معتبر ثابت کرنے کے ہم معنی تھا جو جھوٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبروں کو برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے پیغمبروں کی سخت ترین مخالفت کی اور ان کے بعد ان کی تاریخ کو اس طرح بگاڑ ڈالا کہ کوئی شخص ان کی سیرت اور ان کے پیغام کو جاننا چاہے تو اس کے لئے اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ممکن ہی نہ رہے۔

اوپر یورپ کے مسیحی لٹریچر کی جو مثالیں، نقل کفر کفر نباشد کے اصول کے تحت درج کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سب کچھ بدترین شکل میں کیا گیا جو دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ آپ کے مخالفین نے آپ کی سیرت اور آپ کے پیغام کو بگاڑنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے۔

مگر یہاں دونوں کے درمیان ایک زبردست فرق ہے۔ دوسرے پیغمبروں کی سیرت اور

ان کے پیغام کو بگاڑنے والے بظاہر اپنے اعتبار سے کامیاب ہو گئے۔ یعنی انھوں نے بگاڑنا چاہا اور عملاً بگاڑ دیا۔ چنانچہ ان سابق پیغمبروں کے بارہ میں آج قرآن کے باہر کہیں صحیح تاریخی ریکارڈ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی نہیں۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کے معاملہ میں صورت حال بالکل مختلف رہی۔ یہاں مخالفین کی ساری کارروائیاں بالکل ناکام ہو کر رہ گئیں۔ لوگوں کی بدترین مخالفانہ کوششوں کے باوجود، آج آپ کی تاریخ اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کا متن اس طرح کامل صورت میں محفوظ ہے کہ اس سے زیادہ محفوظ اور مستند صورت موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ فرق دراصل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الرسل ہونے کا عظیم الشان ثبوت ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے، وہ علم الٰہی کے مطابق، سلسلہ نبوت کے خاتم نہ تھے۔ ان کے بعد بھی نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہنے والا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا کہ ان کے مخالفین کی معاندانہ کارروائیوں کو غیر موثر بنا دے تاکہ وہ ان کی تاریخ اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنے سے عاجز رہ جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ علم الٰہی کے مطابق وہ آخری رسول اور خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پھر کوئی نبی یا رسول آنے والا نہ تھا، اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کامل طور پر محفوظ رہے۔ کیوں کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کے غیر محفوظ ہو جانے کی صورت میں دوسرے نبی کا آنا ضروری ہو جاتا۔

خاتم النبیین صرف سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے نہ تھے، اسی کے ساتھ آپ مخالفین حق کے لئے اس موقع کو بھی ختم کر دینے والے تھے کہ وہ پیغمبر کی سیرت اور اس کی تعلیمات کو بگاڑنے یا مٹانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ختم نبوت لازمی طور پر حفاظتِ نبوت کی مقتضی ہے، اور اس کا اہتمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری طرح کر دیا گیا ہے۔

اب پیغمبر کی آمد کا سلسلہ بلاشبہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر خود ختم نبوت ہی کے طفیل میں مومنان نبوت کو ایک عظیم الشان خدائی مدد ابدی طور پر حاصل ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ پیغمبر خدا کی سچی اور بے آمیز دعوت کو لے کر اٹھیں تو ان کے مخالفین کی بڑی سے بڑی کوششیں ہباءً منثورا ہو کر رہ جائیں گی۔ دعوتِ رسالت کو بدنام کرنے یا اس کو ناکام بنانے کی ہر کوشش کا وہی انجام

ہوگا جو خود ذات رسالت کے معاملہ میں ہوا۔ یہ خداوند عالم کا فیصلہ ہے، اور خداوند عالم کے فیصلہ کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

ختم نبوت کا لازمی تقاضا حفاظت نبوت ہے، اور حفاظت نبوت کا لازمی تقاضا حفاظت امت۔ یہ تینوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ختم نبوت اس کے بغیر مکمل نہیں کہ نبوت کا ریکارڈ پوری طرح محفوظ حالت میں موجود رہے۔ اور اس عالم اسباب میں نبوت کا ریکارڈ اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ ایک امت مسلسل اس کی پشت پر کھڑی ہوئی ہو۔

یہ صورت حال امت محمدی کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اب امت کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ نبوت کی چوکیدار بنی رہے، جس میں نبوت کی تبلیغ و اشاعت بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ اس کے بعد اغیار اور اعداد کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کا کام خود خدا کی طرف سے قیامت تک کیا جاتا رہے گا، اس کے لئے امت کو الگ سے اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس میں تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک مفصل تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: موجودہ زمانہ میں اسلام کا احیاء، مسائل اور امکانات۔

۲۔ محمد حسین مقدم صاحب (پیدائش ۱۹۵۴) عرب میں رہتے ہیں۔ وہ کلاتھ امپورٹر ہیں۔ اپنے کام کے سلسلہ میں انھیں اکثر انگلینڈ، سوئزرلینڈ، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں میں جانا ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ الرسالہ انگریزی کے پرچے رکھتے ہیں اور سفر کے دوران جن سنجیدہ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے ان کو پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جو لوگ پڑھتے ہیں وہ اچھے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ صدر اسلامی مرکز کا ایک درس ۲۰ اگست ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس کا موضوع "عقیدۂ آخرت کا عقلی تجزیہ" تھا۔ درس کے بعد حاضرین میں سے ایک صاحب کا خط مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۸۸ موصول ہوا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ یہ ہے:

I take this opportunity to inform you that your talk on *Akhirat* had tremendous effect on the audience. Your points have been very well received and appreciated. One of the persons, who attended the meeting for the first time, said that he never expected such deeply explored materials from a theologian. (S. Shafiuddin, M.A.)

۴۔ جن جاگرن جن کلیان مومنٹ کی آل انڈیا کانفرنس ۱۷-۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ کو کانچی پورم (مدراس) میں ہوئی۔ اس میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کے نام دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ مگر بعض دوسری مصروفیات کی بنا پر موصوف اس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ تحریک کے ذمہ داروں کے نام مرکز کا انگریزی لٹریچر بذریعہ ڈاک روانہ کر دیا گیا ہے۔

۵۔ "گاڈ ارائزز" خدا کے فضل سے جدید طبقہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں ایک خط کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔ مسٹر ایس بورا (سپرنٹنڈنگ انجینئر آسام) اپنی فرمائش بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں:

Please rush me one copy of *God Arises* (In English language) by Maulana Wahiduddin Khan.

۶۔ الرسالہ مشن کے ذریعہ خدا کے فضل سے ایک نیا ذہن بن رہا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ ایک مقام کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں ایک شرپسند نے خنزیر کاٹ کر اس کا سر مسجد کے اندر ڈال دیا۔ فجر کے وقت چند مسلمان جب اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آئے تو انھوں نے خنزیر کا سر دیکھا۔ یہ الرسالہ کے پڑھنے والے لوگ تھے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ہی اس کو بوری میں لپیٹا اور لے جا کر ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا۔ یہ واقعہ جب مشہور ہوا تو بستی کے سربرآوردہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے۔ جو واقعہ عام حالات میں بستی کی بربادی کا سبب بنتا وہ بستی کے اندر مسلمانوں کی اخلاقی عظمت اور ہندو مسلم تعلقات کی بہتری کا سبب بن گیا۔

۷۔ مسٹر کے۔ این۔ تیاگی (ریڈر میرٹھ کالج۔ میرٹھ) اپنے خط ۳ ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں:

I am a regular reader of your benevolent Journal for over a year now. Its contents are not to the benefit of Muslims alone but to the people of all communities, castes and creed and to the members of any sex. The article 'A Journey' by Maulana Wahiduddin Khan (*Al-Risala*, Sept. 88) was revealing. The Conference on Communalism and National Integration held in August 1986 at Bombay gave the matured, deep rooted thinking of the Maulana on the vulnerable subject of communalism. At a time when fundamentalists in various communities are bent upon injecting the venom of communalism into the blood of ignorant masses this article and sustained thoughts portraying the real man in the Maulana will go a long way to diffuse the detonator of the communal bomb. I keep the Maulana with great esteem. I have carefully read the book *Muhammad — The Prophet of Revolution* by the same author.

۸۔ الرسالہ میں جس طرح دعوت پر زور دیا جا رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قارئین الرسالہ میں عام طور پر دعوت کا طاقت ور جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ لوگ اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف صورتوں میں دعوتی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں۔ ایک بڑے مقام پر بہت سے بیرونی ماہرین کام کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ وہاں ہمارے ساتھی ان سے رابطہ قائم کر کے الرسالہ انگریزی انھیں پہنچا رہے ہیں۔ احمد شریف صاحب (سیلم) نے حال میں اپنا نیا گھر بنوایا تو تعمیر کے دوران غیر مسلم

مزدوروں اور مستریوں کو الرسالہ کے مضامین پڑھ کر سناتے اور ٹامل زبان میں اس کی تشریح کرتے ۔ وغیرہ

۹۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (حیدرآباد) کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد کی صدسالہ برسی منائی گئی ۔ اس کے تحت حیدرآباد میں تین روزہ پروگرام تھا ۔ اس کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا ، اور ۱۲ نومبر ۱۹۸۸ کے پروگرام میں صدر اسلامی مرکز کو چیف گیسٹ کے طور پر مقرر کیا گیا ۔ مگر صدر اسلامی مرکز اپنی بعض مصروفیات کی بنا پر اس میں شریک نہ ہو سکے ۔ البتہ متعلقہ موضوع سے متعلق کچھ تحریری مواد کانفرنس کے منتظمین کے نام روانہ کر دیا گیا ۔

۱۰ ۔ ایک صاحب اپنے خط یکم ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : الرسالہ میری روح کی غذا بن چکا ہے ۔ وہ قدم قدم پر میری رہنمائی کرتا ہے ۔ اس طرح میں بہت سے غلط اقدام سے محفوظ رہتا ہوں ۔ یہ الرسالہ ہی ہے جس نے مجھے اس قابل کیا کہ میں اپنا احتساب خود کر سکوں (ڈاکٹر انور عباس ، امروہہ)

۱۲ ۔ ڈاکٹر شکری سری لنکا کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں ۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۸ میں الرسالہ (انگریزی) کے پیغام اور اس کی زبان و اسلوب کا غیر معمولی اعتراف کرتے ہوئے مرکز کی انگریزی کتابوں کے بارہ میں مزید لکھا ہے :

I am also very much pleased to receive your two books *Religion and Science* and *God Arises*. You have marshalled all your arguments beautifully and convincingly in justifying the case for Divine revelation and also invalidating the secularist, empirical approach in the understanding of the mysteries of the universe and life. This will no doubt clear the mental confusion in which the contemporary youths are entangled due to the pernicious influence of modern secular civilization. (Dr M.A.M. Shukri)

۱۲ ایک صاحب اپنے خط ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں کہ الرسالہ کئی سالوں سے زیر مطالعہ ہے ۔ الحمد للہ الرسالہ وقت کی اہم ترین تحریک ہے ۔ یہ وہ آواز ہے کہ انشاء اللہ اس آواز سے قلوب مسلم ایسے بیدار ہوں گے جو اسلاف اسلام کی جیتی جاگتی تصویر ہوں گے ۔ یہ وہ شمع ہے جو ہر اس قلب میں منور رہے گی جس میں ایمان کی چنگاری موجود ہو (حبان رحیمی ، بنگلور)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ - سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف - سورۃ الناس

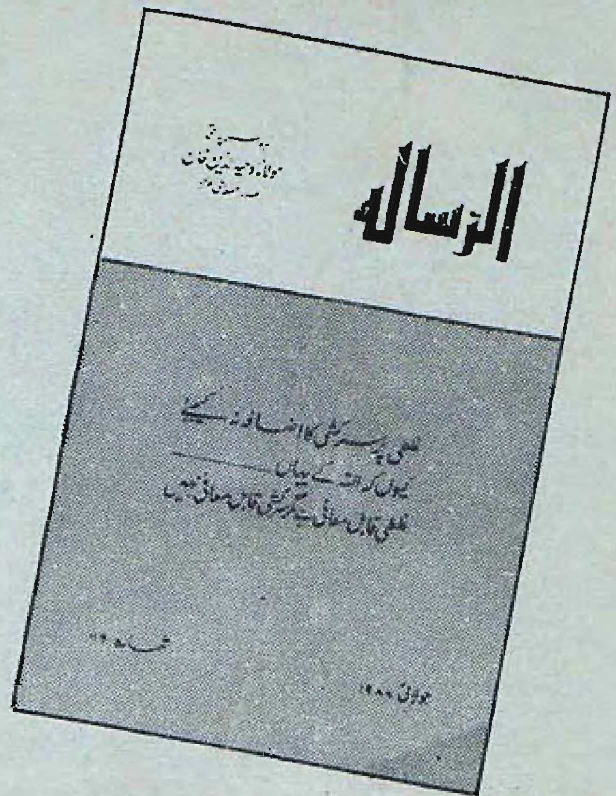
قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ
جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN. 28822/76 December 1988 No 145

GIFTING The Word of God



To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

☐ URDU

☐ ENGLISH

☐ ONE YEAR

☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS. 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES

Rs. 4